تین پیسے کی چھوکری

تین پیسے کی چھوکری

قاضی عبدالغفّار

مکتبۂ شاہراہ۔ دہلی
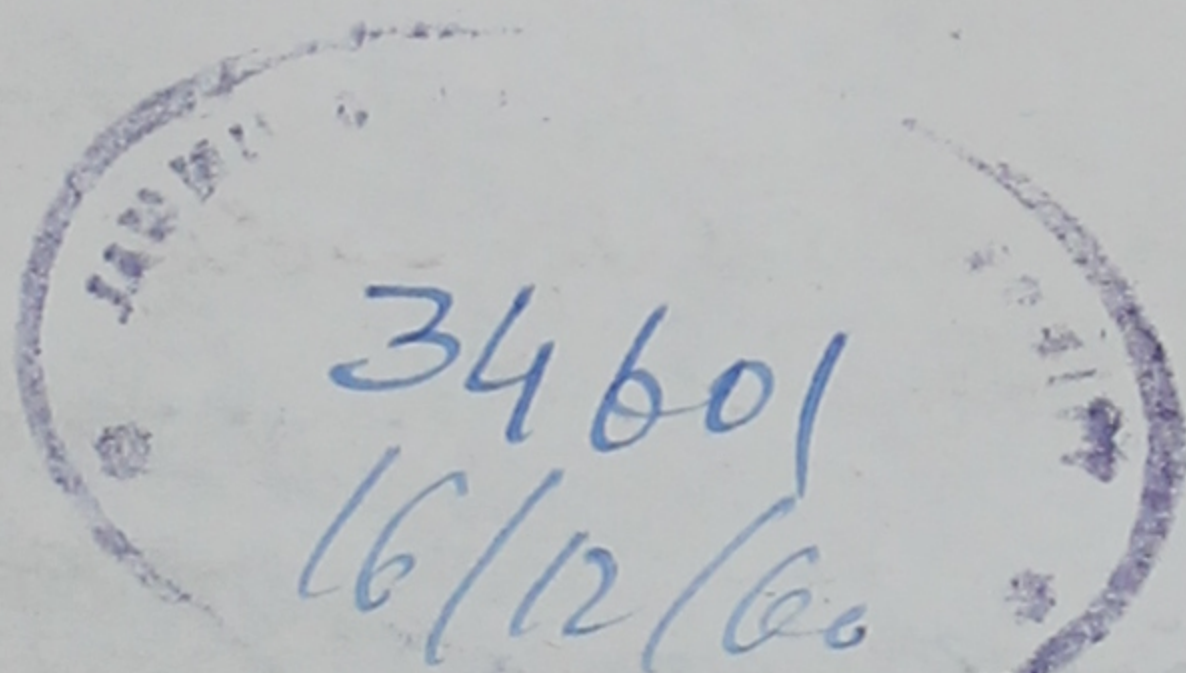
تعداد ۱۰۰۰
اکتوبر ۱۹۵۹ء

قیمت -/۲

(خواجہ برقی پریس دہلی)

دیباچہ

یہ سب کسی زمانہ کے چند کفنائے ہوئے مُردے ہیں جن کو ان اوراق میں دفن کرتا ہوں۔

میں افسانہ نگار کبھی نہ تھا، نہ ہوں کبھی کبھی سرِ راہ قلم کچھ دائرے اور زاویے ایسے بنا دیتا ہے، فن کے اعتبار سے نوک و پلک پر غور نہ کیجئے۔ وہ تنقید و تبصرے کے حریف نہ ہو سکیں گے۔

یہ جو کچھ ہے منظم افسانہ نگاری نہیں ہے، بلکہ ایک انتشار ہے۔ مصوّر، ناقد اور مبصر سے زیادہ میں اپنے حال سے واقف ہوں اور وہ یہ ہے کہ:۔
انشاپردازی کے لحاظ سے میں فن کے ہر شعبہ پہ حاوی ہوں۔ سوائے افسانہ کے بحیثیت ایک ادیب کے میرا قلم فن کے ہر پہلو پہ حاوی ہے۔ سوائے ادبیات کے۔ اس "آغازِ کلام" کے بعد خاتمہ کلام جو کچھ ہوگا وہ ظاہر ہے!

اہلِ ذوق سے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ افسانے اُن کے قابل نہیں۔ اس لئے کہ ــــــ نہیں ہیں۔ اگر نقادانِ سخن اور اہلِ فن ان اوراق کو بنظرِ تنقید دیکھنے کا ارادہ کریں گے تو میرے گھبرائے ہوئے ضمیر کی بے اطمینانی کچھ اور بڑھ جائیگی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اوراقِ پریشان صرف اُن اصحاب کے پڑھنے کے قابل ہیں اور ان ہی سے ہیں ان اوراق کو منسوب کرتا ہوں، جو میری طرح افسانہ لکھ نہ سکتے ہوں مگر لکھنے مزدور ہوں! ــــ اور اس قسم کے میرے ساتھی بہت ہیں۔ اُن کی کثرت میں، میں اپنے ان شاہکاروں کو بالکل محفوظ سمجھتا ہوں۔

عبدالغفار

حیدرآباد

۲۸ر جنوری

تین پیسے کی چھوکری

آج سے پندرہ سو برس پہلے۔

بائی زنطہ کے شاہی سرکس میں، بادشاہ کے وحشی جانوروں کا داروغہ ایک بوڑھا شخص تھا۔ بہت بوڑھا، مگر اپنے کام میں بہت ہوشیار۔ اُس نے اپنے بوڑھاپے کا سہارا ایک بارہ سالہ چھوکری کو بنا لیا تھا جس کو نہ معلوم وہ کہاں سے لایا تھا وہ نہ اس کی بیٹی تھی نہ پوتی، نہ رشتہ دار نہ اُس کی ہموطن، لیکن اُس نے اُس کو منہ بولی بیٹی بنالیا تھا، اور بیٹی ہی کی طرح چاہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اُس کی چھوکری کی قوم کیا ہے، اُس کا مذہب کیا ہے اور وہ کس طرح بڈھے کے پاس پہنچی۔

بائی زنطہ کے عظیم الشان دار السلطنت میں شہنشاہ جسٹینین کا پرچم اقبال بلند تھا۔ اُس زمانہ کی تہذیب اور بائی زنطی مخلوق کا تمدن، خصوصاً امراء اور عمائدین کی معاشرت یونان و روما کی قدیم تہذیب سے بھی دس پانچ قدم آگے تھی۔

شہنشاہ اور اُس کے امرا اور ارکینِ سلطنت کے اسبابِ تفریح و تعیش میں سے ایک یہ سرکس بھی تھا جس میں ہزاروں قسم کے وحشی اور جنگلی جانور پالے جاتے تھے ۱۲ برس کی چھوکری کو دنیا میں کوئی کام نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ سرکس کے درندوں میں صبح سے شام تک کھیلتی رہتی۔ وہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی اور دل اُس کا ایسا ہی بے خوف تھا جیسا کہ وحشی درندوں کا۔ اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ خوف کس چیز کا نام ہے۔ وہ شیروں کی ایال پکڑ کر لٹک جاتی تھی۔ اور دوپہر کو کھیلتے

کھیلتے۔ اکثر ہاتھی کے پیٹ کے نیچے لیٹ کر سو جاتی تھی۔ اس کی دنیا میں اس کے رفیق اور یار، شیر اور ہاتھی اور ریچھ ہی تھے۔

دن بھر بڈھا سرکس کے جانوروں کی خدمت میں مصروف رہتا اور چھوکری اپنے کھیل میں۔ شام کو وہ دونوں گھر چلے جاتے، مگر ایک دن شام کو چھوکری سرکس سے تو چلی گئی لیکن گھر نہ پہنچی۔ رات بھر بڈھا اس کا انتظار کرتا رہا رات بھر وہ غائب رہی اور صبح کو وہ ہنستی ہوئی گھر آئی اور بڈھے کے ہاتھ پر تین چمکتی ہوئی اشرفیاں رکھ دیں۔ یہ اس کے حسن کا پہلا سودا تھا۔ یہ اس کی جوانی کا پہلا منافع تھا۔ گزری ہوئی شام اور موجودہ صبح کے درمیان گذشتہ شب کی تاریکی میں بڈھے کی چھوکری عورت بن گئی۔

راتوں کو غائب رہنے کا سلسلہ جاری رہا اور سرکس کے درندوں کے ساتھ جو کھیل ہوا کرتا تھا، وہ اب دوسری قسم کے حیوانوں کے ساتھ کھیلا جانے لگا! یہ آغاز تھا ملکہ زلطہ کی حکومت کا۔

تھوڈورا کی جوانی اب ہر طرف سے آنکھوں، نظروں، اور دلوں کو کھینچ رہی تھی۔ وہ شاہی سرکس میں ناچا کرتی تھی اور بائی زنطہ کے ہزارہا نظر باز ہر شام کو اس کے حسن کی خاطر سرکس میں جمع ہوا کرتے تھے۔ شاہی دربار کے رنگین رنگین لٹب و جلیس نے تو ایک دن تھوڈورا کو ناچتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار کہہ دیا۔

"گھاس کا یہ پھدکتا ہوا کیڑا کسی دن سارے بائی زنطہ میں اچھلیگا، دیکھنا!"

لیکن اُس وقت لنبب کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ستم ظریفیٔ قدرت اس ناچنے والی کو نہ معلوم کہاں سے کہاں تک اچھالنے والی تھی۔

تھوڈورا سرکس کے نظربازوں سے تھک گئی۔ ایک ہی کھیل کا بار بار کھیلنا اس کو کبھی بھاتا نہ تھا۔ اب وہ منظرِ عام پر تھرکنے کی بجائے مخصوص خلوتوں میں ایک بلند نشیں حُسن فروش بن بیٹھی۔ حسن فروشی اُس عہد کی تہذیب میں کوئی ایسی معیوب بات نہ تھی بلکہ حسن و ہوس کے یہ کھیل تماشے تو بائی زنطی تہذیب کے جزو لازمی تھے۔ امرا طوائفوں کی نگہ التفات کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے اور عوام کی زندگی ان رنگین تیلیوں کے بغیر بے رنگ ہو جاتی تھی۔ حسین تھوڈورا اپنی دوکانِ حسن کھولتے ہی دلوں کی مالک، آنکھوں کا تارا، کلیجوں کی ٹھنڈک اور گھروں کا چراغ بن گئی لوگ اُس کے سنگِ آستاں پر جبین نیاز رکھتے۔ دل چلے سپاہی اور میدانِ جنگ کے سورما اُس کے اشارۂ ابرو کا انتظار کرتے۔ اُن کی خوں آشام تلواریں اُس کے قدموں میں ٹھوکریں کھایا کرتیں۔ اہل علم اور اہل مذہب بھی اس دیوی کے استھان پر سر جھکاتے تھے اور سرکس کی ناچنے والی چھوکری بائی زنطہ کی حسن پرست دنیا میں ایک ملکۂ عالم تھی کہ اُس کا سکہ ہر طرف جاری تھا۔

نوجوان شہنشاہ جسٹینین بارہا اُس کو تھیٹر میں ناچتے، باغوں میں اٹھکیلیاں کرتے اور باسفورس کے ساحل پر ایک ہجومِ عاشقاں کے ساتھ چہل پہل کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے دل میں خلش تھی۔

ایک شب شہنشاہ نے اپنے محافظ دستے کے کپتان کو موتیوں کا ایک بیش قیمت ہار دیکر تھوڈورا کے گھر بھیجا اور پیام دیا کہ وہ شاہی خلوت میں آئے۔ آدھی رات کے قریب شاہی کپتان تھوڈورا کے دروازے پر آیا۔ تھوڈورا کی خلوت میں اُس کا کوئی چاہنے والا موجود نہ تھا۔ اُس نے کپتان کو گھر کے اندر نہ بلایا بلکہ خود دروازے پر آگئی شہنشاہ کا پیام سن کر اُس نے کہا۔

شہنشاہ کی یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ، مگر یہ ہار واپس لے جائیے میں بکاؤ نہیں ہوں، شہنشاہ سے کہہ دیجئے کہ اس ہار سے کسی دوسری حسین چھوکری کا حسن خرید لیں۔ میری قیمت اس ہار سے بہت زیادہ ہے"

اب وہ سرکس کی بجائے ایک عظیم سلطنت کے شیر اور ہاتھی سے بے خوف ہوکر کھیل رہی تھی۔

اُسی شب پھر ایک شاہی مصاحب، شہنشاہ کا پیام، بہت سے تحائف اور اکرام والطاف کے بہت سے وعدے لیکر آیا۔ تھوڈورا نے دوسرا پانسہ پھینکا۔

شہنشاہ سے کہہ دیجئے کہ وہ اس کنیز کے طالب ہیں تو اُس کے سیاہ خانہ پر تکلیف فرمائیں۔

بائزنطہ کے شہنشاہ سے جس کی خاک پا بادشاہوں اور گردن کشوں کی سجدہ گاہ تھی، یہ گستاخانہ سوال وجواب موت سے کھیلنا تھا۔ مگر تھوڈورا نے بہت بڑی بازی لگائی تھی۔

شب کی آخری ساعتوں میں بالآخر شہنشاہ خود اس کے دروازے پر آیا۔ جس وقت وہ اندر داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ تھوڈورا ایک صلیب کے سامنے جھکی ہوئی عبادت

میں مشغول ہے بہت دیر بعد اس نے اس طرح کہ وہ گویا کسی دوسرے عالم میں ہے نظر اٹھا کر شہنشاہ کی طرف دیکھا۔

"تم ہی تھوڈورا ہو؟" شہنشاہ نے سوال کیا۔

"ہاں حضور میرا نام تھمڈورا ہے۔ میں شہنشاہ کے سرکس میں ناچا کرتی تھی۔"

"تم وہی ہو جس کو ہر ملاح تین پیسے میں خرید لیا کرتا ہے؟" شہنشاہ کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

تھوڈورا نے کہا:۔

"جی ہاں میں وہی ہوں۔"

"پھر تم شہنشاہ کی خلوت میں آنے سے کیوں انکار کرتی ہو؟" اب جسٹینین کا غصہ تیز ہوتا جاتا تھا۔

"حضور!" تھوڈورا نے دست بستہ عرض کیا: "ملاح کے پاس میں اسلئے جاتی ہوں کہ اس کی جیب میں تین ہی پیسے ہوتے ہیں، اور وہ سب میں لے لیتی ہوں۔ وہ تین پیسے دیکر اپنا سارا سرمایہ مجھے سونپ ڈالتا ہے۔"

"تو کیا تم اپنے چاہنے والوں سے جو کچھ ان کے پاس ہو سب ہی لے لیتی ہو؟"

"ہاں حضور! میں یہی کرتی ہوں اور یہی میری قیمت ہے۔"

"تو پھر مجھ سے تم کیا مانگتی ہو۔؟"

"آپ کا تاج و تخت! اے بائی زنطہ کے شہنشاہ!"

اس طرح چند روز بعد یہ "تین پیسے کی چھوکری" شہنشاہ بائی زنطہ کی مشہور

عالم ملکہ تھوڈورا بن کر اس زمانہ کی سب سے بڑی اور عظیم الشان سلطنت کے سیاہ و سفید کی مالک بنی۔

وہ اپنا حسن بیچتے بیچتے ملکۂ عالم بنی اور ملکۂ عالم بن کر جب اس کو حسن فروشی کی ضرورت نہ رہی تو اس نے بائی زنطہ کے خوبرو نوجوانوں کی جوانی خریدنا شروع کردی اس کی ہوس پرستی کی داستانیں اسی قدر مشہور ہیں جس قدر اس کا حسن!

تین پیسے کی چھوکری

(ب)

مسیح کی پیدائش کے پانچسو برس بعد
بائی زنطہ کے دارالسلطنت میں
شہنشاہ جسٹینین اور اُس کی عیش پرست ملکہ تھیوڈورا کا زمانہ

بائی زنطہ کی شاہراہ پر تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ شہنشاہ اور ملکہ عالم کی رعایا سڑک کے دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں جمع ہے۔ یہ وہ سڑک ہے جو شاہی محل ایاصوفیہ کو جاتی ہے۔ دورویا سپاہی کھڑے ہیں۔ سپاہیوں کے عقب میں اہلِ شہر، امراء و روساء سب ملکۂ عالم کی سواری کے منتظر ہیں۔

ہفتہ میں ایک دفعہ ملکہ تھیوڈورا۔ ایاصوفیہ میں عبادت کرنے جایا کرتی ہیں یہ جلوس قابلِ دید ہوتا ہے۔ ملکۂ عالم کے شاندار جلوس کو دیکھنے والے گھنٹوں پہلے سے سڑکوں پر جمع ہوتے ہیں اور دارالسلطنت میں ہفتہ کا یہ ایک دن گویا ایک عام یوم تعطیل ہوتا ہے۔ وہ ملکۂ عالم کی عبادت کا دن ہے۔

دیگریا کے محافظ دستہ کا ہراول سرخ وردیاں پہنے، شاندار گھوڑوں پر سوار آہستہ آہستہ چلا آتا ہے۔ سواروں کی وردیاں اور اُن کے چمکتے ہوئے اسلحہ دھوپ میں اس قدر چمک رہے ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ اس دستہ کے پیچھے ایک مرصع تخت رواں ہے اور اس تخت کے تنائی پر ایک مطلا شامیانہ کے نیچے ملکۂ عالم تشریف رکھتی ہیں۔ تخت رواں کے

سامنے امراء اور اراکین سلطنت کی نوجوان حسین لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے لیئے ہوئے اور آٹھ چھوکریاں ہاتھوں میں چاندی کی گھنٹیاں لیئے ہوئے چل رہی ہیں۔ چاندی کی گھنٹیاں تھوڑے وقفے کے بعد بجائی جاتی ہیں تخت رواں کے سامنے شاہی منصب دار قرمزی رنگ کا لمبا کپڑا بچھاتے ہوئے آتے ہیں اور ملکہ کی سواری جب اس کپڑے پر گزر جاتی ہے تو اس کو لپیٹ لیتے ہیں۔ منصبداروں کی جماعتیں یہ خدمت انجام دیتی آتی ہیں تاکہ ملکۂ عالم کے تختِ رواں کا سایہ ناپاک زمین پر نہ پڑے۔

تختِ رواں، جواہر اور سونے چاندی کی ضیاکاری کا ایک عجیب وغریب نمونہ ہے۔ اس کی چمک میں سورج کی شعاعوں نے گویا آگ لگا دی ہے ــــ اس طرح بائی زنطہ کی ملکہ دو رویہ خلائق کے سلاموں کا جواب سر کے اشارے سے دیتی ہوئی مسیح کی درگاہ میں جا رہی ہے۔

سلطنت کے دیہاتی علاقے کا رہنے والا ایک خوبصورت نوجوان استینیعن جو چند روز ہوئے دارالسلطنت کی سیر کرنے آیا تھا۔ اس وقت ایک کنیسہ کی دیوار پر کھڑا ہوا شاہی جلوس کا تماشا دیکھ رہا ہے اس کے قریب اسکا ایک شہری دوست کھڑا ہے۔ سواری قریب آگئی۔ دفعتاً ملکۂ عالم کی نظر اس دیہاتی نوجوان پر پڑی۔ مگر وہ نہ سمجھا، وہ یہ سمجھا کہ یہ غلط انداز نظر برسرِ راہ تھی۔ مگر وہ خوش تھا کہ آج اس نے ملکہ عالم کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ بادشاہوں کا دیدار عقیدتمند رعایا کے دلوں کو پھول کی طرح کھلا دیتا ہے۔

اسٹیفن بے چارے نے اپنی عمر میں پہلے کبھی شاہانہ طنطنہ کا یہ مظاہرہ کب دیکھا تھا، وہ اس نظارے میں محو تھا کہ ملکہ کی سواری بالکل اُس کے سامنے آ گئی۔ ایک لمحہ کے ہزارویں حصہ میں اُس نے یہ محسوس کیا کہ گویا اُس کی نظر ملکہ عالم کی نظر سے ملی۔ گھبرا کر اُس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اتنی ہی دیر میں سواری آگے نکل گئی۔ اسٹیفن کا دل دھڑک رہا تھا اُس کو پسینہ آ گیا تھا۔

شاہی سواری کے پیچھے پیچھے ایک منصب دار چاندی کے پھول لٹاتا ہوا جا رہا تھا، غریب اور امیر بڑھ بڑھ کر اُن پھولوں کو لوٹ رہے تھے جس کے ہاتھ ایک پھول آ گیا اُس کو گویا بڑی سعادت نصیب ہوئی۔ منصب دار جب بڑھتے بڑھتے اسٹیفن کے قریب پہنچا تو اُس نے اپنا ہاتھ لوگوں کے اوپر سے اسٹیفن کی طرف بڑھایا۔ اُس کے ہاتھ میں چاندی کے پھول اور ایک تازہ گلاب تھا۔ اسٹیفن نے جیسے کوئی مخمور ہو یا عالم خواب میں، ہاتھ بڑھا کر گلاب لے لیا، وہ چاہتا تھا کہ کچھ کہے، شکریہ ادا کرے لیکن اتنی ہی دیر میں منصب دار بہت آگے نکل چکا تھا۔

سواری بادِ بہاری گذر گئی۔ مجمع منتشر ہو رہا ہے۔ اسٹیفن گلاب کا سرخ پھول ہاتھ میں لئے جا رہا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر شاہی منصب دار خاص طور پر اُس کی طرف کیوں مائل ہوا۔ ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں گلاب کا پھول تنہا اُسی کو کیوں دیا گیا۔؟

گلاب بہت بڑا اور خوبصورت تھا۔ وہ اس قسم کا پھول تھا جس کے چند ہی درخت شاہی باغیچہ میں تھے۔ اور شاہی باغیچہ کے علاوہ کہیں نہ تھے۔ یہ گلاب باقی زنسطہ میں شاہی محل کے علاوہ کہیں میسر نہ آسکتا تھا۔ مجمع سے باہر نکل کر اسٹیفن نے بغور اس پھول کو دیکھا۔ اس کی پتیوں کے نیچے ایک پرزہ بندھا ہوا تھا اس پرزہ پر سرخ رنگ سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

شاہی محل کے جنوبی دروازہ پر — آج دس بجے — یہ پھول لیکر آؤ — اس سے تمہاری قسمت کا دروازہ کھُلیگا۔

اسٹیفن ششدر رہتا۔ وہ کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس واقعہ کے معنی کیا ہیں۔ وہ کیوں محل کے دروازے پر جائے۔ اس کی قسمت کا دروازہ کیونکر کھُل سکے گا۔ اُس کا دل کہتا تھا :-

"جانا چاہیئے۔ اگر یہ شاہی اکرام والطاف کا اشارہ ہے تو تیری قسمت جاگ جائے گی۔ کیا معلوم تو شاہی دربار میں منصب دار بنا دیا جائے۔ کیا معلوم تو کیا ہو جائے۔ جانا چاہیئے۔"

عقل کہتی تھی :-

"کوئی دھوکا کوئی فریب تو نہیں۔ بھلا کہاں ملکۂ عالم کہاں تو غریب دہقانی، منصب دار نے تیرے گنوار پن کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ یا کسی دشمن نے تجھے دھوکا دیکر نہ بلایا ہو۔"

عقل اور دل کا جھگڑا ختم نہ ہوتا تھا لیکن قدم دل کے فرمانبردار تھے۔ عقل کا زور اُن پر

نہ چل سکا۔ وقت مقررہ سے کچھ پہلے اشنیت کے قدم بلا ارادہ شاہی محل کی طرف بڑھنے لگے۔ کبھی اپنے دل سے اور کبھی اپنی عقل سے اُلجھتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا ـــــــــــ

دل کہتا ہے،

"تیرا انتظار کیا جا رہا ہے۔ قدم بڑھا۔"

عقل کہتی :۔

"تو بیوقوف ہے۔ تیرا اور انتظار! دیوانے! سپاہیوں اور دربانوں کی ٹھوکریں کھائے گا۔"

....

جوانی کا خون گرم تھا۔ دل کی حرکت تیز تھی۔ چہرہ پر سرخی جھلک رہی تھی۔ پیشانی پر پسینے کے قطرات تھے۔ اس طرح اشنیت شاہی محل کے دروازہ پر پہنچا۔ اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دروازہ مغربی ہے یا مشرقی ہے۔ وہ بڑھا چلا گیا۔

شاہی محافظ فوج کا ایک دستہ بڑے دروازہ میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے قدموں کی آواز اور تلواروں کی چمک اشنیت کو اپنے ساتھ کھینچے ہوئے اندر لیگئی۔ وہ محل کے پہلے برآمدہ میں داخل ہوا جہاں شاہی دربان مسلح کھڑے تھے ایک قوی الجثہ حبشی یادگار کے سرا پردے کے پاس ایک برہنہ تیغہ ہاتھ میں لئے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ اشنیت نے بڑھ کر سُرخ گلاب اُس کے سامنے پیش کیا ـــــ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہے کیا ـــ؟

دربان مسکرایا۔ "بیوقوف آدمی! مجھے کوئی حسین چھوکری سمجھا ہے تو نے؟ گدھا! ـــ"

اسٹیف کے بدن میں ان تحقیر آمیز الفاظ نے آگ لگادی وہ بے اختیار ہو گیا۔ اُسے خبر نہ تھی کہ کسی طرح اُس نے دربان کے سیاہ ناب گال پر ایک چانٹا مارا!۔۔۔ سارے برآمدہ میں شور مچ گیا۔ محافظ دستے کے سپاہیوں نے اپنی تلواروں کے قبضوں سے مار مار کر اسٹیف کو فرش پر گرادیا۔ چند منٹ میں اُس کا خاتمہ ہو جاتا۔ مگر ہنگامہ کی آواز سُن کر دربانوں کا داروغہ کمرہ سے نکل آیا۔ اُس کو دیکھ کر سپاہیوں نے ہاتھ روکا۔

"ارے تو کون ہے، دہقانی؟" داروغہ نے کہا۔

اسٹیف جھنجھلایا ہوا اُٹھا۔ اُس کا گلاب زمین پر گر گیا تھا۔ اُس کی چند پتیاں منتشر ہو چکی تھیں۔ جھک کر اُس نے گلاب کو زمین سے اٹھالیا اور اٹھا کر داروغہ کے سامنے پیش کر دیا۔

"ہاں!" سُرخ گلاب کو دیکھ داروغہ مسکرایا "بیوقوف آدمی اس پھول کو لے کر یہاں کیوں آئے۔؟"

پھر اُس نے مجمع کی طرف دیکھ کر سپاہیوں کو جھڑکا۔

"جاؤ! اپنا کام کرو، کیا کچھ تماشا بنایا ہے۔؟" جب سپاہی ہٹ گئے تو اُس نے اسٹیف کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دبی زبان سے کہا۔

"یہ حماقت کی تم نے! اس پھول کو لے کر یہاں گھس پڑے۔ تمہیں جہاں یہ پھول لیکر جانا چاہیئے یہ وہ جگہ نہیں۔"

یہ کہکر وہ اسٹیف کو اپنے ساتھ ایک دوسرے دروازہ پر لے گیا۔ اور وہاں کے چوبدار کو آواز دیکر کہا:۔

"لو یہ ایک بیوقوف پھول والا آیا ہے۔ اِس کو اندر پہنچاؤ۔ یہ آدمی ہماری

طرف کا نہیں ہے۔ تمہاری طرف کا ہے۔

ملکہ کے چوبدار نے پھول پر نظر کی اور استیف کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ملکہ کے محل کے دروازے میں داخل ہو گیا۔
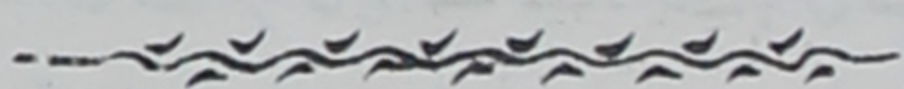
آراستہ خوبصورت برآمدوں اور کمروں سے گذر کر ــــ آگے آگے چوبدار اور اس کے پیچھے استیف ــــ دونوں ایک پُرفضا باغیچہ میں داخل ہوئے جس کے وسط میں ایک فوارہ جاری تھا۔ اس کے پانی کی سطح پر سینکڑوں رنگین پھول تیر رہے تھے۔ باغیچہ سے گزر کر ملکۂ عالم کی خاص محلسرا تھی۔ محلسرا کے برآمدوں میں نوعمر اور خوبصورت لڑکے زرق برق لباس پہنے ہوئے۔ حسین ماماٸیں اور باندیاں خوفناک شکل کے خواجہ سرا اور حبشی غلام جن کے سروں پر زرد پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کچھ بیٹھے اور کچھ لیٹے، کچھ ٹہل رہے تھے۔ کچھ چھوکریاں قدم بڑھائے اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں استیف کے دہقانی وضع اور پھر اس کے ہاتھ میں سرخ گلاب کے پھول کو جس نے دیکھا وہ منہ پھیر کر مسکرا دیا۔ شاہی خواصیں اپنے ہاتھ کے پنکھوں کی آڑ میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں اور کم عمر لڑکے منہ پر ہاتھ رکھ رکھ کر اپنی ہنسی کو روک رہے تھے۔

استیف کو اپنے گرد و پیش ان حرکات کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ چوبدار کے پیچھے پیچھے پردہ اٹھا کر شاہی محلسرا کے خاص کمروں میں داخل ہوا۔
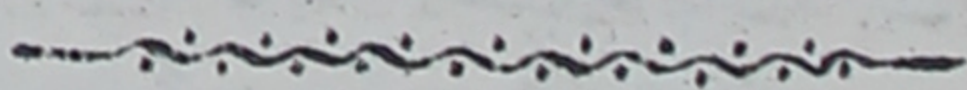
ایک مزین کمرہ کے ایک گوشے میں، ریشم کے قرمزی پردوں کی آڑ میں، اپنے بڑے بڑے گدوں اور تکیوں پر ملکۂ تھوڑا آرام فرما رہی تھی۔ ایک رنگیں فوارہ فرد

کے وسط میں جاری تھا۔ چھوٹی میزوں پر تازہ پھولوں کی ڈھیریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جنکی مہک سے تمام کمرہ معطر تھا۔

کچھ ایسی ہلکی روشنی، ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر کمرے میں آرہی تھی۔ جیسی کے رات کے ختم ہونے اور دن کے شروع ہونے کے وقت ہوتی ہے —— وہ سب جنت کا ایک تخیل تھا۔ جس کو اسنیفت نے آج اپنی عمر میں پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا —— ریشم کے پردوں کی آڑ سے اس دھندلی روشنی میں ملکہ نے اشارہ کیا۔ کمرے کے سکون کامل میں، رومی قالینوں پر اسنیفت کے قدموں کی آواز گم تھی وہ ادب کے ساتھ آگے بڑھا۔ اور اس نے ملکہ عالم تھوڑا دور اکا آغوش محبت اپنے لئے کھلا ہوا پایا۔
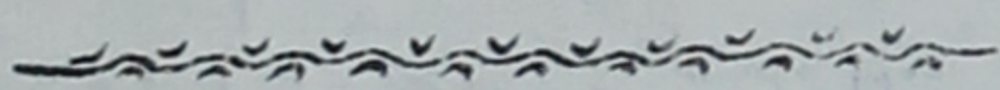
"تمہارے جانے کا وقت آگیا" نظریں نیچی کئے ہوئے ملکہ نے فرمایا۔

اسنیفت کے جسم میں ایک عجیب لرزش ایک عجیب سنسناہٹ تھی جو آج سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

وہ ابھی تک ملکہ کے آغوش کی مستیوں سے مخمور تھا —— اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جب اس نے کہا۔

"کیا پھر کبھی ملاقات نصیب ہوگی۔؟"

ملکہ مسکرائی! اسنیفت اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا۔ کہ یکایک وہی خواجہ سرا جو اس کو اندر لایا تھا۔ کمرے میں داخل ہوا۔ اسنیفت چونکا۔ اس کو محبت کی خلوت میں خواجہ سرا کی یہ در اندازی ناگوار گذری۔ گویا یہ سیاہ فام حبشی اس کی اس نئی محبت کے راز کو فاش کئے دیتا ہے۔ لیکن ملکہ سے اپنے سوال کا جواب نہ پاکر وہ یک گونہ مایوس

ہوا۔ اور سر جھکائے دروازے کی طرف ہٹنے لگا۔ ملکہ کے ہونٹ ہلتے دیکھ کر وہ پھر ذرا اڑ کا۔

"استیف کل پھر آؤ۔"

ملکہ کے شیریں لبوں سے یہ شیریں پیام الفت کس قدر روح پرور اور دل نواز معلوم ہوا۔

اس دھندلی روشنی میں ملکہ — نہ جانے کس طرح — اس کمرے سے جا چکی تھی۔ استیف نے اس کو جاتے نہ دیکھا لیکن اس کی جگہ خالی تھی اور استیف "وعدہ فردا" کی مسرتوں سے جھومتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

اس کے اور دروازے کے درمیان چند قدم باقی تھے کہ ایک حبشی غلام کی نوکدار چھری اس کی پشت پر چمکی اور چشم زدن میں اس کی پشت کی طرف سے سینہ کے پار ہو گئی۔ وہ صرف ایک ہچکی لے کر دروازے کے سامنے فرش پر اوندھا گر گیا۔

غلام نے چند لمحے اپنی چھری کو اس کے گرم جسم میں آرام لینے دیا۔ اس کے بعد اس کے خون آلود پھل کو باہر کھینچ لیا۔ استیف کے سر کے لمبے بالوں سے اس حبشی نے اپنی چھری کا خون صاف کیا۔ پھر لاش کی ٹانگ پکڑ کر اس کو کھینچتا ہوا کمرہ کے باہر لے گیا۔

اس کمرے کے فرش پر، جہاں استیف نے ایک لمحے کے لئے تھوڑورا کے آغوش میں محبت کی ایک بازی لگائی تھی۔ سرخ گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی رہ گئیں اور ان پتیوں میں سے ایک پر استیف کی جوانی کے گرم خون کا صرف ایک قطرہ جما ہوا

رہ گیا تھا۔

جب چند ملاح اپنی کشتیاں ساحل کی طرف لا رہے تھے، شاہی محل کے دروازے سے باسفورس کے پانی میں ایک سربند تھیلا۔ جو خون آلودہ بھی تھا بہتا نظر آیا۔

ملاحوں نے دیکھا اور اپنے پتوار تیزی سے چلانے لگے۔ اُن کے لئے اس قسم کی کوئی نئی چیز نہ تھی۔ ہر روز صبح شام وہ دیکھا کرتے تھے کہ شاہی محل سے باسفورس کی بھوکی مچھلیوں کی یہ مخصوص غذا پانی بہا پھینکی جاتی ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا، باہر زنانہ میں کسی کو معلوم نہ تھا، کہ رحم دل ملکۂ عالم "حسن کی دعوت" کے بعد باسفورس کی مچھلیوں کے لئے اپنے حسن کے دسترخوان سے تازہ غذائیں پہنچایا کرتی ہیں۔

وہ میرا انتظار کر رہی ہے

زندگی کے پُرشور دریا میں رات کے وقت کتنے دئیے بہے چلے جاتے ہیں!
حیاتِ انسانی کے کہساروں میں کتنے جگنو چمکتے ہیں اور پھر ان کو ظلمتِ شب اپنی چادر میں لپیٹ کر نہ جانے کہاں لے جاتی ہے۔ آسمان پر کتنی بجلیاں چمکتی ہیں اور پھر کالے بادلوں میں مُنہ چھپا لیتی ہیں۔ بادل کی گود سے ہزار مرتبہ نکلتی ہیں اور پھر اسی میں جا کر چھپ جاتی ہیں۔

یہ آٹھ پہر کی داستان ہے۔ گوشِ ہوش سنتا ہے اور چشمِ عبرت دیکھتی ہے۔
ظاہر کی تشریح بیکار اور عیاں کا بیان فضول پھر کیجئے کیا، کہ دل کے زخموں کا لطف کریدنے سے دونا ہوتا ہے۔ مسکین فاختہ اپنے زخم کو اپنے پروں سے چھپا لیتی ہے، مگر انسان زخم کو کریدتا رہتا ہے کہ کہیں خلش کم نہ ہو جائے۔ خون نہ رُک جائے۔!

اس کے زخم کی جان بہتا ہوا گرم خون اور دکھتا ہوا جسم ہے۔ گرم خون اگر نہ بہے تو تالاب کے پانی کی طرح میلا اور ناپاک ہوتا ہے، جسم اگر دکھے نہیں، تو وہ کچھ بھی نہیں خاک ہے۔ سفر حرکت کا نام ہے اور حضر موت ہے۔ زندگی زخم ہے اور موت اس کا اندمال ہے۔

پس میری آنکھوں سے دیکھو کہ میرا سفر خارِ مغیلاں کے بغیر بے لطف رہتا ہے۔
اور میری منزل درد کی تڑپ اور زخموں کے بغیر سونی اور ویران!

چمن کی کیاریوں میں جب نسیم شمالی آتی ہے۔ تو اس کے جھونکے بند کلیوں کو کھلا دیتے ہیں۔ مگر جو پھول کھل چکے ہیں اُن کی پتیوں کو ہر طرف بکھیر دیتے ہیں۔

میرے مُرجھائے ہوئے پھولوں کی کیاریوں میں جب کبھی کوئی جھونکا آتا ہے تو وہ دو چار پتیاں اڑا کر لے جاتا ہے۔ پتیاں خشک ہو جاتی ہیں مگر بے رنگ نہیں ہوتیں۔ ان کا اُجڑا ہوا رنگ بھی دورِ بہار کی ایک داستان بیان کرتا ہے۔

ہاں! ان خشک پتیوں کی داستان خشک نہیں ہے۔ آبشار کی ملکہ سے پوچھو وہ میری داستان کی تصدیق کرے گی۔ میری داستان اُسی کی داستان ہے۔ کیا وہ بھول گئی ہو گی۔؟
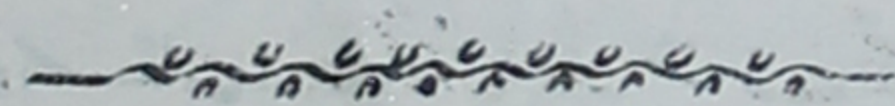
ایک شعاعِ نور تھی کہ فضائے بسیط میں چمکی اور اپنے ہی نور میں محو ہو گئی۔ زندگی کا ایک ہلکا سا نغمہ تھا کہ ہوا کا ایک جھونکا اُن کو کہیں سے لایا اور لے گیا۔

— ایک ننھی کلی تھی کہ پھول بنی اور مرجھا گئی۔ یا ستارہ امید تھا کہ چند لمحوں کے لئے اپنی خنک روشنی سے دنیا کو منوّر کر کے رخصت ہو گیا۔ ... ... تھا کیا؟ مجھ سے نہ پوچھو، میں جانتا ہوں! مگر بتاؤں گا نہیں۔ ہاں نہیں بتاؤں گا! اور کیونکر بتاؤں کہ بتا سکتا نہیں۔ اگر کوئی شخص آنکھ کے نور اور روح کی گہرائی کو چھو سکتا ہو۔ تو صرف وہی، اس شعاع نور، اس نغمہ حیات، اس ستارۂ امید کی حقیقت سے بھی آشنا ہونے کا دعوےٰ کرے۔

میں نے ایک خواب دیکھا تھا، اور زندگی میں وہ میرا شاید پہلا اور آخری خواب تھا۔ میں نے دیکھا کہ آسمان پر ستارے رقص کر رہے ہیں۔ ماہتاب کی شعاعیں

کانپ رہی ہیں۔ چادر ماہتاب کبھی ایسی خنک اور جاں بخش نہ تھی۔ جیسی کہ اس شب کو ماہتاب کی ایک کرن پر جو آسمان سے زمین کی طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرح جیسے وہ تارہ کے تار پر موسیقی، میں نے اس کو کھیلتے ہوئے پایا! زمین سے آسمان تک عالم لاہوتی تھا۔ اور اس فضا میں زندگی کا ایک چشمہ ابل رہا تھا۔ اس چشمے کے آبشار ہنستے ہوئے پھولوں اور مسکراتی ہوئی کلیوں کے انبوہ میں اس طرح گر رہے تھے کہ گویا بے تابانہ لوٹ رہے ہیں۔ نور کی ان موجوں میں بہت سی سرخ اور سبز مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ کھیل رہی تھیں۔ رقص کر رہی تھیں۔ مگر ایک زمردیں مچھلی ان سب کے درمیان تھی۔ جو نہ کھیلتی تھی نہ رقص کرتی تھی۔ اس کے سر پر ایک در شاہوار تھا کہ اس کا مثل میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آبشار کی روانی کے ساتھ یہ ماہیٔ زمردیں ایک عالم استغراق میں کچھ کھوئی ہوئی پھولوں اور کلیوں میں الجھ الجھ کر پیچھے ہٹتی اور پھر آگے بڑھتی تھی۔ آگے نکل کر پھر پیچھے ہٹتی تھی، پھر آگے جاتی تھی۔ ہر شاخ گل سے الجھتی تھی ہر پھول کو مس کرتی تھی اور گویا مایوس ہو کر کبھی آگے بڑھ جاتی تھی کبھی پیچھے ہٹ آتی تھی، وہ اس عالم رنگ و بو میں سب سے علیحدہ اور سب کے ساتھ تھی۔

بھری نظروں میں طاقت نہ تھی۔ کہ اس کا راستہ روکیں۔ میں نے ہاتھ بڑھایا۔

انسان کا خود غرض ہاتھ!! جو پھولوں اور کلیوں کو صرف اس لئے مسلتا ہے کہ ان کا مسلنا اس کی حیوانیت کے لئے تسکین بخش ہے۔ رنگ و بو کو رنگ و بو کی خاطر وہ پسند نہیں کرتا۔ اس کو تو محض اپنے نفس کی "طلب" آگے بڑھا کر پھولوں کے توڑنے اور سبزہ کے مسلنے پر آمادہ کرتی ہے۔

میرا خود غرض ہاتھ پانچ انگلیوں کا جال لیکر آگے بڑھا۔

پھولوں کے جھنگٹے میں ابھی اس ماہئی زمردیں نے شاید دو چار ہی چکر لگائے تھے کہ میرا ہاتھ اُس کی کمر تک پہنچا۔ اور وہ شاید نہ پہنچ سکتا۔ اگر میں خود تا بہ کمر پانی میں نہ پہنچ گیا ہوتا۔

پھول میرے جسم کو مس کر رہے ننھے کلیاں مجھے گدگدا رہی تھیں۔ پھر میں دیوانہ وار اس سبز پوش پر دستِ ہوس دراز کر رہا تھا۔ یہ تو میں نہ کہوں گا کہ قصور تنہا میرا ہی تھا اس لئے کہ اگر میں نے ہاتھ بڑھایا تھا تو کچھ کشش اس کی طرف سے بھی تھی۔ اس کے زمردیں لباس اور اُس کے حسنِ تمام نے بھی میرے دستِ طلب کے ساتھ سازش کی تھی اور شاید آبشار کے اُن شریر پھولوں نے بھی مجھے اشتعال دلایا تھا۔ بہر حال میرا گناہ آلودہ ہاتھ، جو خدا جانے کتنے پھول مسل چکا تھا۔ پانی کی اُس ملکہ تک پہنچا اور میں نے سمجھا کہ اب تمام شہنشاہی میرے ہی لئے ہے ... ... لیکن شاید دستِ طلب کی صرف ایک انگلی میں نے اس جسدِ زمردیں کو چھوا ہو گا کہ ایک بجلی میری آنکھوں کے سامنے چمکی اور جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ آبشار زندگی کی وہ کجکلاہ ایک شعاعِ نور بن کر سطحِ آب سے نکلی۔ یہ یک آن واحد چمک کر اٹھی اور میری آنکھوں کے سامنے سے گذر کر ماہتاب کے ہالہ میں جا بیٹھی ... ... آج تک میں اُس کو اپنے تختِ آسمانی پر متمکن دیکھتا ہوں اور پچھتاتا ہوں کہ میں نے اس کو چھوا کیوں تھا۔

صبح کو جب کہ ہنوز دامنِ مشرق چاک نہیں ہوا تھا میں اُس آسمان کی ملکہ کو خاموش آسمان پر صبح کاذب کی روشنی میں جھلملاتے دیکھتا ہوں شب کو بھی میری نظر اُسی ستارہ پر جمی ہوئی تھی جس کی خنک شعاعیں اپنا پیام لے کر رات بھر

میرے پاس آتی رہتی ہیں اور میرا پیام لے کر آبشار کی اس زمردیں ملکہ تک واپس جاتی ہیں، جو اپنے آسمانی مسکن میں نور کا لباس پہنے بیٹھی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ پس جس دن میرا یہ جسدِ خاکی سُپردِ خاک ہوگا۔ اس دن تم اس ستارے کے چاروں طرف ایک ہالہ دیکھو گے۔ وہ ہالہ میری رُوح ہوگی۔

(سنہ ۱۹۱۸ء)

میں

وہ جو فلسفہ زندگی کا سمندر ایک کوزہ میں بند کر دیتا تھا۔ ترجمانِ فطرت غالب! اپنے ایک مصرعہ میں زندگی کی ساری داستان یوں کہہ جاتا تھا، اب سر دھنا کیجئے

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہو!

اس "خلوت" میں کتنی انجمنیں سجائی جاتی ہیں۔ اور ان انجمنوں میں کیسے حشر بپا ہوتے ہیں۔ اور کیوں جانیئے۔ اپنی یا میری ہی خلوت کی انجمنوں کو دیکھ لیجئے۔ میں آج اپنی انجمن کو دوسروں کی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔

ایک زمانہ تھا اور وہ زمانہ کیفِ حیات اور نشاطِ زندگی کا زمانہ تھا، جب خاک کا ہر ذرہ زریں، ہر قطرہ خون لعل بدخشانی، ہر زخم ایک تبسم، ہر آواز نغمہ اور پانی کا ہر قطرہ شراب ناب تھا۔ جب دل کی مستانہ کیفیتیں عقل کی رہنمائیوں پر ہنستی تھیں اور ہر برگِ خزاں رسیدہ ایک صحنِ چمن نظر آتا تھا۔ یہ وہ دن تھے کہ خلوت خانہ خیال میں عجیب عجیب محفلیں جما کرتی تھیں۔

اب ان تصویروں کا رنگ دھندلا نظر آتا ہے۔ اب بھی ان تصویروں کو ایک نظر دیکھ لیجئے۔

دولت کی کرشمہ کاریوں کا تماشہ!

زرکار مسندیں، مخملی گدے، دیبا و اطلس کے پردے۔ اس قدر معمولی چیزیں کہ میں اپنے گرد و پیش نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ مشرق میں عالیشان دیوانخانے مغرب میں سر بفلک کوٹھیاں، سب گھر کی باتیں ہیں! مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق جاتا ہوں۔ خاک کے ہر ذرہ کو طلائے خاص پاتا ہوں۔ مشرق کے دیوانخانے میں ایک مرصع پیچوان میرے سامنے ہے اور مغرب کے قصر دولت و اقبال میں بہترین رکابدار میرے دسترخوان کے سامنے دست بستہ حاضر ہیں۔ جب چاہتا ہوں مشرق کی زرکار قبا اور مرصع سرپیچ کو مغرب کی عشوہ فروشیوں پر نثار کر دیتا ہوں۔ اور جب چاہتا ہوں مغرب کے خزانوں کو مشرق کے صنم کدہ پر قربان۔

یا پھر ایک دن دیکھتا ہوں کہ مجھے مغرب نے اپنے آغوش محبت میں کچھ اس طرح لے لیا ہے۔ کہ میں اب زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتا۔ مشرق و مغرب کا فساد، ظلمت و ضیا اور تہذیب و جہالت کے سارے مناقشے ایک اونچی ایڑی پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ وطن! کیا وہ مشرق میں ہے؟ اس قربان گاہ پر ایک ادنیٰ نذر عقیدت ہے۔ جس کو سب سے پہلے پیش کر دینا چاہیئے۔ اس مغربی دیس کی "روشنی" کے بغیر زندگی ایک اشک شبنم ایک آواز ماتم ایک زخم اجل سے زیادہ نہیں۔

یا پھر کسی دن میرے خلوت خانۂ خیال میں ایک خوفناک فرشتہ آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ تیری جگہ یہ نہیں ہے۔ چل۔ کہ تجھے سیر آدھ سیر چاندی کے بدلے میں غلام بن جانا چاہیئے۔

دماغ، دل، ضمیر، ناطقہ، غیرت، حمیت، حتیٰ کہ اپنی روح معہ اُس کی تمام لاہوتی طاقتوں کے تجھے اس چاندی کے لیئے فروخت کرنی ہونگی۔ غرور انسانی کو جو تیرا بہترین خلعت ہے اسی طرح اتار دینا ہوگا، جس طرح تیرے دادا نے جنت میں گیہوں کے چند دانوں پر اُس کو قربان کر دیا تھا ـــــ یہ سنت تجھے بھی ادا کرنی ہوگی۔

فرشتے مجھے کہاں سے کہاں لے آیا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک دن رات کے ۲۴ گھنٹے مصیبت مشقت اور ذلت کی بوجھل گاڑی، زندگی کے اس ویران راستے پر اپنا سفر پورا کرتی ہے۔ مگر ہر شام کو میں اپنی گاڑی اسی جگہ پاتا ہوں جہاں سے صبح روانہ ہوئی تھی۔

مجھے یہ سفر مہلت نہیں دیتا کہ میں زندہ ہونے کا دعویٰ کرسکوں۔ یا جو مجھ کو مردہ کہتے ہیں ان کو اپنے اندر ایک ذرا سا نشانِ حیات دکھا کر جھٹلا سکوں۔
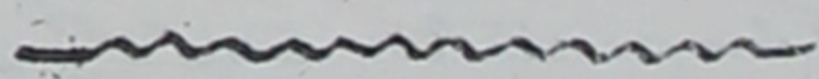
کتاب خلوت کے ورق کتنی جلدی الٹ جاتے ہیں اور اس داستانِ خیال کا ہر باب کس قدر مختصر ہے! آج میں اپنے کو لاکھوں نفوس کا قائد اول دیکھتا ہوں۔ گو کہ لچھمی کی نگاہِ کرم کا ہنوز منتظر ہوں۔ تاہم شہرت نے اپنا تاج میرے سر پر رکھ دیا ہے اپنے کو خلق خدا کی عافیت کا ضامن پاتا ہوں اور ان ذمہ داریوں کو، جو خلق خدا کے متعلق میں نے اپنے پر عائد کرلی ہیں۔ پھولوں کے ہار کی طرح گلے میں ڈالے پھرتا ہوں۔ تاکہ جدھر جاؤں لوگ ان پھولوں کی مہک سے مست ہو کر پکار اٹھیں۔

"ہمارا لیڈر آیا۔"

دلوں کی تسخیر دیوتاؤں کا ایک مخصوص فن ہے۔ جس کو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے

زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ میرے طنبورہ کا ہر تار دلکش نغموں سے بھرا ہوا ہے۔ اور ان میں میری انگلیاں ہر موقعہ کے مناسب ایک ناقابل فتح جاذبیت پیدا کردیتی ہیں

صحنِ مسجد میں مسجد کا علم میرے ہاتھ میں ہوتا ہے، مدرسہ میں کون ہے جو مجھے "ناہرِ تعلیم" نہ کہے؟ سیاست کی اُلجھنوں کو کس کا ناخنِ تدبیر سُلجھاتا ہے۔

"بزرگانِ ملت" کی صفِ اولی میں گویا ہر نظر مجھ پر ہی پڑتی ہے! ... ... مسجد! مدرسہ یا بازار کچھ ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس سر پر شہرت کا تاج رکھا ہو۔ اس کو نیچا نہ ہونا چاہیئے اور اس حالت میں کہ ہاروں اور بدھیوں کا بوجھ گردن کو جھکا دے۔ یا اُس حالت میں کہ میری معصوم اور بے خبر "بھیڑیں" میری گاڑی کھینچ رہی ہوں اس حالت میں میرے پیشہ کے اساتذہ اور ماہرین کہہ گئے ہیں کہ) اخلاق اور انکسار اچھا اور زود اثر نسخہ ہے! انسان کا لباس ہر موقعہ کے مناسب ہونا چاہیئے۔ وہ ادائے بے نیازی جو ہم ہی لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور صرف ہمارے ہی قبیلہ کا نشانِ امتیاز ہے ایک سپر ہے جو ہمارے چہروں کو ادنیٰ درجہ کی مخلوق کی ناپاک نظروں سے محفوظ رہ سکتی ہے، ورنہ جارحانہ کارروائی کے لئے تو انکسار ہی بہترین حربہ سمجھا گیا ہے۔

یہ تصور ہی ناممکن ہے۔ میری ہر تصویر ہی نامکمل ہوا کرتی ہے۔ میرے خلوت خانہ کا ہر مرقع ادھورا اور ہر آئینہ دھندلا ہوتا ہے۔ یہی ... زندگی کا طور ہے!!!

ایک دن میں نے دیکھا کہ سورج کی روشنی نہایت ٹھنڈی اور موسم گرما کی ہوائیں بہت خنک ہیں۔ تمام کائنات پر ایک سکونِ مطلق طاری ہے۔ اور ... ... میں ایک میز کے سامنے تنہا بیٹھا ہوں، کاغذوں اور کتابوں کا انبار میرے سامنے ہے اور میرا

تمام وجود رُوحانی اساتذۂ سلف کے اُن دماغوں پر لوٹ رہا ہے جو میرے سامنے بکھرے ہوئے ہیں اعظمتِ گذشتہ کی یادگاریں۔ سطوتِ دیرینہ کے افسانے' شاہراہِ حیات کے بہت سے نشانِ راہ، شہر کے مینار' دولت کے شکستہ در و دیوار درد کے افسانے' دل کی کہانیاں، غرضیکہ میری میز پر ایک محشرِ خیال برپا ہے۔ اور میں .... ؟ نہ اتنا بلند ہوں کہ خدا کی مخلوق مجھے مور و ملخ سے کمتر نظر آئے' نہ اتنا پست ہوں کہ خلقت کے گرداب مصیبت میں پھنس جاؤں۔ اس تنکے کی طرح جو دریا کے بہاؤ سے جدا ہوتا ہے، میرا سکوتِ مطلق مجھ کو بہاؤ سے الگ۔ لئے کھڑا ہے۔ گذرنے والوں کے پیام مجھ تک آتے ہیں میرے پیام اُن تک جاتے ہیں، مگر میرے قریب کوئی نہیں آتا' اور میں کسی کے قریب نہیں جاتا۔ ایک فقیر جس پر مکھیاں بھنک رہی ہوں اور ایک امیر کہ اس پر سمندر کے موتی اور خشکی کے ہیرے نچھاور ہو رہے ہوں میرے لئے یکساں ہیں، میرا استغنا دونوں سے دور ہے۔

انیس و مومن و ذوق و غالب کی روحیں مجھ سے ملنے آرہی ہیں۔ حافظ و سعدی اور خسرو کے پیغام محبت مجھ تک پہنچ رہے ہیں۔ مِکالے۔ شیلے اور بائرن کی دعائیں میرا دامن پکڑے ہوئی ہیں۔ دنیا میرے شہرت کا تاجِ زریں بنا بنا کر لاتی ہے۔ اور میں اس کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہوں۔

غلامانِ وقت میرے لئے امتیازی تمغے تجویز کرتے ہیں اور میں ان کو کھڑا دیکھتا ہوں ـــ مکھیاں ہیں کہ میرے کمرے گھس آئی ہیں ـــ کتاب کے ہر ورق میں میری روح سما جاتی ہے۔ اور میرے چھوٹے سے حجرے میں میری ساری دنیا آباد ہے۔

صبح کو یہ حجرہ بھی خالی ہو جاتا ہے، اور اس وقت جبکہ صبح کے دروازۂ خاور سے غالب کا "نگارِ آتشیں رُخ" اپنی زرچھی شعاعوں کا جال پھیلا کر سارے برفستانِ ہمالہ کو اپنے سنہرے آغوش میں لینا چاہتا ہو، اور اس بلندی سے عروسِ دہر کے حُسن مشاطہ طلب کے لئے افشاں کی پڑیاں باندھ باندھ کر پھینک رہا ہو۔ اس وقت جبکہ صنوبر کی مست ہو کر جھومنے والی ڈالیوں کے راگ ہمالہ کی وادی امین پر محیط ہو رہے ہوں، جب شبنم کے قطروں میں رنگین روشنی کی ریزش جاری ہو ــــ اور اس وقت جبکہ اُفق پر رات کے بھاگے ہوئے سیاہ تاب بادلوں کی زرنگاری اور طلائی جھالر ہمالہ کی پیشانی کا جھومر بن رہی ہو ــــ اس وقت ایک خاموش آواز۔ ایک روشن تاریکی۔ ایک مشاہدۂ فطرت جو آنکھ کا منت کش نہیں۔ ایک آواز جو مُنہ سے نہیں نکلتی ـ مگر کانوں تک پہنچتی ہے۔ ایک گرفت جو بغیر ہاتھ کے بھی ممکن ہے مجھ کو آغوشِ فطرت سے اٹھا کر ایک ناپیدا کنار قلزمِ محبت میں غوطے دیتی ہے اور اس صبح کو میں جس طرح سمندر کا روشنی والا مینار موجوں کو حقارت کے ساتھ ٹھکراتا ہے ــــ اسی طرح عالمِ حیات کی جاذبیت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوں .... دُنیا کو خبر نہیں ہوتی ــــ اور ہوتی بھی تو وہ کیا کرتی ہے ــــ کہ میں اس سے بہت دُور ہوں !!!
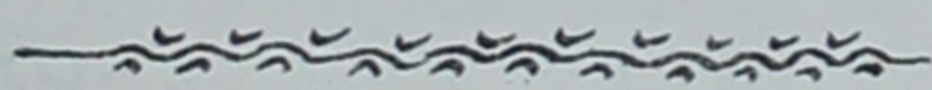
میرے کان میں کوئی کہتا ہے ـ ہمالہ کی چوٹی پر کب تک بیٹھے رہو گے ؟ ویرانوں اور ریگستانوں میں بھی جانا ہے۔ سُورج کی شعاعیں کبھی ٹھنڈی بھی ہو جائیں تو ہمیشہ ٹھنڈی نہیں رہا کرتیں ؛ !!!

سنہ ۱۹۱۸ء

قمیض

اناطول فرانس کا تخیل

اُس کی رعایا اُس سے خوش تھی۔ اس کے امراء اُس سے رضامند تھے۔ اُس کے اہل و عیال اُس کا دم بھرتے تھے۔ وہ نہایت نیک انسان اور نہایت رعایا پرور بادشاہ تھا، اس نے مزاج شگفتہ، طبیعت نیک اور دل صاف پایا تھا۔

مگر وہ چند روز سے بیمار تھا۔ مرض کسی کی سمجھ میں آتا نہ تھا۔ اطبا کی کوششیں ضائع ہو رہی تھیں۔ رعایا پریشان۔ شاہی محل میں ہر شخص متردد اور اراکین سلطنت سرگرداں تھے۔۔۔۔ کیا علاج ہو کہ جہاں پناہ کی طبیعت سنبھلے؟ دن، ہفتے، مہینے گذرے چلے جاتے تھے اور مریض کی حالت کل شام کے مقابلے میں بدتر ہوتی جاتی تھی۔۔۔
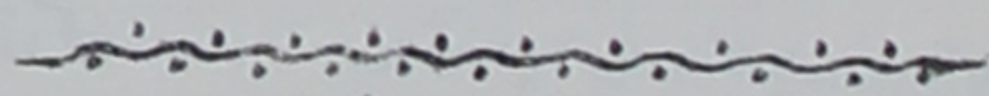
مرض بھی عجیب تھا۔ نہ بخار تھا نہ درد تھا۔ نہ دُکھن تھی نہ ورم تھا۔ مگر جسم کا خون خشک ہوتا جاتا تھا۔ نبض کمزور ہوتی جاتی تھی۔ مریض کا مزاج پژمردہ۔ طبیعت سرد اور قلب کمزور ہوتا جاتا تھا۔ نہ ہونٹوں پر تبسم تھا۔ نہ باتوں میں چاشنی۔ احباب کی صحبت بھاتی نہ تھی۔ اہل و عیال کی محبت دل کے کنول کو کھلا سکتی نہ تھی۔ ذوق نفرت سے، اور لطف بے لطفی سے بدل گیا تھا۔ یوں کوئی فکر نہ تھی کوئی وجہ نہ تھی۔ کوئی

خطرہ نہ تھا۔ زندگی ویسی ہی پرسکون تھی جیسی ہمیشہ رہتی۔ مگر پھر بھی زندگی بے کیف تھی۔
دسترخوان لذیذ اغذیہ سے بھرا ہوتا تھا۔ مگر وہ دو نوالوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔
موسیقی کے بہترین ماہر حاضر ہوتے تھے اور اپنا ساز چھیڑنے سے پہلے ہی سامنے سے
ہٹا دیئے جاتے تھے۔ دربار شاہی کی حسین رقاصہ ہر شام کو مجرا عرض کرتی تھی اور اشارہ
ہوتا تھا کہ ہٹ جاؤ۔ چلی جاؤ۔ غرض یہ کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ جہاں پناہ بیمار کیا ہیں۔
یہ سب کو معلوم تھا کہ بیمار ہیں!

مرض کی تشخیص نہ ہو تو علاج کیونکر کیا جائے۔ شاہی اطباء اور امراض کے
بڑے بڑے ماہرین آتے تھے۔ گھنٹوں معائنہ کرتے تھے۔ نبض پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے
تھے۔ دل کی حرکت کو شمار کرتے تھے۔ خون کا امتحان کرتے تھے۔ دوائیں دیتے
غذائیں بدلتے سب کچھ کرتے جو کرنا چاہیئے لیکن مرض کی نوعیت کا پتہ نہ چلا سکتے۔ صبح
سے شام تک اراکین دولت، وزراء اور امراء محل کے خاموش کمروں میں۔ دالانوں میں
اور شہ نشینوں میں بیٹھے ہوئے سرگوشیاں اور مشورے کرتے رہتے تھے۔ لیکن فہم
قاصر اور عقل حیران تھی۔

اس زمانہ میں ہمسایہ سلطنت کا ایک طبیب دنیا میں بہت مشہور ہو رہا تھا۔ وہ
اس قدر طبیب نہ تھا جس قدر کہ حکیم تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ نہ دوا دیتا ہے نہ نسخہ
لکھتا ہے۔ مگر جو علاج کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے۔ ذرا سے چٹکلوں اور معمولی ترکیبوں سے
وہ مریض کے مزاج پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور نہ جانے کیونکر مرض اس کی گرفت میں

آجاتا ہے۔ دُنیا میں اس کے کمالات کا چرچا تھا۔ اور بالآخر جہاں پناہ کے امراء نے اس کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔ عمالِ حکومت تیز رفتار سواریوں پر بھیجے گئے اور ملکوں ملکوں اس حکیم کو تلاش کر کے آخر لے آئے۔

مریض کی حالت اب سے بدتر ہو چکی تھی۔ نشست و برخاست کی طاقت باقی نہ تھی۔ زندگی کے دریا کا پانی خشک ہو چلا تھا۔ جو باقی تھا وہ بھی روز بروز خشک ہوتا جاتا تھا۔

حکیم صاحب آئے۔ نبض دیکھی۔ حالات سُنے۔ اور کوئی نسخہ نہ لکھا۔ اور اپنے معمول کے مطابق کئی دن تک نیم اعتکاف کی حالت میں غور کرتے رہے۔ آخر ایک دن انہوں نے تمام اراکین خاندان شاہی۔ امراء اور وزرا کو جمع کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"بادشاہ کی بیماری لا دوا ہے۔"

شاہزادوں اور شہزادیوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ امراء و وزرا کو پسینہ آ گیا۔

"لا دوا ہے مگر"

حاضرین کے چہروں پر خون کی سُرخی جھلکی۔ حکیم صاحب کے ساتھ سب بول اُٹھے۔

"مگر ... ..."

"مگر۔" حکیم صاحب نے فرمایا "علاج ہو سکتا ہے۔"

سُننے والوں میں سے بعض کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ بعض نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ حکیم صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"علاج ہوسکتا ہے ـــ لیکن پینے، کھانے اور لگانے کی دوائیں بیکار ہیں"۔

پھر اہلِ شوریٰ کے چہروں کا رنگ بدلا۔ ان میں کسی نے گھبرا کر کہا۔

"تو پھر حکیم صاحب؟ پھر کیا کیا جائے۔؟"

"کچھ نہیں"، حکیم صاحب نے فرمایا۔

"کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں؟ کیوں حکیم صاحب کچھ بھی نہیں؟" سب نے گھبرا کر کہا۔

"حکیم صاحب نے اپنی ٹوٹی ہوئی گفتگو کا دھاگا جوڑا۔

"سنئے سنئے جو دوا بتاتا ہوں اس کو تلاش کیجئے۔ جہاں پناہ کے خون میں وہ ذرات فنا ہو گئے ہیں، جن کی گردش و حرکت اطمینانِ قلب اور حقیقی مسرت پیدا کرتی ہے۔ اطباء کی دوائیں ان ذرات کو پیدا نہیں کر سکتیں۔ طب معذور ہے۔ نہ وہ ذرات ایسی چیز ہیں۔ کہ کسی معدن میں کسی پہاڑ پر کسی جنگل میں یا کسی جانور یا انسان کے خون میں تلاش کئے جاسکیں۔ یہ ذرات روح سے بھی زیادہ غیر محسوس ہیں۔"

"پھر وہ کہاں ملیں۔؟" کسی نے گھبرا کر سوال کیا۔

حکیم صاحب نے اس جملہ معترضہ پر کوئی توجہ نہ کر کے اپنا سلسلہ گفتگو جاری رکھا۔

"ایک ایسا انسان ڈھونڈیئے جس کے جسم و جاں اور دل و دماغ کا اطمینان بہمہ وجوہ حاصل ہو ـــ بہمہ وجوہ ـــ سمجھے آپ؟ اس کی میلی قمیض جو اس کے بدن پر ہے مانگ لائیے یا اتار لائیے۔ جس طرح مل سکے لائیے اور جہاں پناہ کو پہنا دیجئے ـــ اس شخص کے جسم کے ذرات صرف اسی طرح بادشاہ کے جسم میں منتقل کئے جا سکتے ہیں اور صرف یہی ایک علاج ہے۔" حکیم صاحب یہ کہکر اٹھ گئے اور وہ خاموشی جو سننے والوں پر

طاری تھی دفعتاً بلند آوازوں میں بدل گئی۔ یہ یک وقت سب کے سب بولنے لگے۔

"یہ کیا علاج ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو کیوں نہیں سکتا۔؟"

"کہاں ملے گی؟ کون لائے گا؟ کوئی ایسا آدمی بھی کہیں ملیگا۔؟"

ہمارے بادشاہ کی سلطنت ایسے خوش نصیبوں سے خالی نہیں ہو سکتی تلاش کی جائے۔ آدمی بھی ملے گا قمیص بھی ملیگی۔ کیوں نہ ملیگی۔؟"

فوراً فوراً کچھ مشکل نہیں جانا چاہیئے۔ ڈھونڈھنا چاہیئے۔"

چنانچہ مصاحبین میں سے دو اس کام کے لئے منتخب کئے گئے کہ وہ جائیں۔ اور ایک ایسی قمیص ڈھونڈھ کر لائیں۔

دونوں روانہ ہوتے ہیں۔

"کیوں بھئی، ایسا آدمی کون ہوگا، بھلا وزیر اعظم سے زیادہ کوئی خوش نصیب ہو سکتا ہے؟ دیکھا نہیں؟ وہ ہر وقت کس قدر بشاش رہتے ہیں" ایک نے کہا۔

"سچ کہتے ہو۔" دوسرا بولا "ہم نے تو کبھی اُن کو آزردہ خاطر دیکھا نہیں۔"

"تو پھر چلو انہیں کے پاس پہلے جا پہنچیں۔"

جہاں پناہ کے دونوں مصاحبین وزیر اعظم کے دیوان خانے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ وزیر اعظم ابھی شاہی محل سے تشریف لائے ہیں۔ ولیعہد سلطنت اُن کو بہت عزیز رکھتا ہے اور چونکہ بظاہر بادشاہ مرض موت میں گرفتار ہیں، ولیعہد

کی امیدوں کا تارہ بہت روشن ہے۔ اور وزیر اعظم انعام واکرام اور اپنے مراتب کی ترقی کا خیال کر کے بہت خوش ہیں۔ شاہی مصاحبین پر وہ ایک غلط انداز نظر ڈالتے ہوئے اپنی حرم سرا میں تشریف لے گئے۔

ابھی حرم سرا میں گئے ہوئے آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ اندر سے شہنائیوں اور خوش آواز باجوں کی آواز آنے لگی۔ معلوم ہوا کہ وزیر اعظم خاصہ تناول فرما رہے ہیں۔ خاصہ کے بعد کچھ دیر آرام فرمائیں گے۔ اس کے بعد اگر حرم سرا میں تفریح کا کوئی شغل شروع نہ ہو گیا تو دیوانخانے میں تشریف لائیں گے۔

ایک گھنٹہ گذرا۔ دو گذرے۔ مصاحبین ہنوز منتظر ہیں۔ کہ دفعتاً محل کے اندر چیخ و پکار اور شور و شغب شروع ہوا باہر کے خدام ڈیوڑھی کی طرف بھاگے اور اندر کی مامائیں چیختی چلاتی دروازے پر آئیں۔

"کیا ہوا کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟"

"بیگم صاحبہ ایک خواص کو چابک سے مار رہی ہیں۔ خواص ستون سے باندھ دی گئی ہے۔ اس کی کمر پر ہزاروں کوڑے پڑ رہے ہیں۔ سرکار نے اپنے کمرے کے کواڑ بند کر لئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کا غصہ! الامان والحفیظ! وہ تو اس وقت آپے سے باہر ہیں۔"

"تو آخر ہوا کیا؟ خواص کا قصور کچھ تو ہوگا۔"

"قصور؟ اجی بس قصور نہ پوچھو۔ ہوا یہ کہ وزیر صاحب کھانے کے بعد آرام فرما رہے تھے کہ نہ جانے کیسے یہ قطامہ ان کے کمرے میں پہنچ گئی۔ پھر کیا تھا۔ پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ بیگم صاحبہ نے سرکار کی داڑھی کھسوٹ لی اور اب خواص کی مرمت ہو رہی ہے۔ سرکار نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا ہے۔ بیگم صاحبہ گرج رہی ہیں۔ خواص لہو

کہاں ہے، تم پوچھتے ہو ہوا کیا؟ اس محل میں تو دسویں بیسویں کوئی نہ کوئی ٹنٹا ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"اجی بس رہنے دیجئے سرکار کی سرکاری معلوم ہے۔ مالک کیا خاک ہیں۔ ان ہی حرکتوں پر کئی دفعہ بیگم صاحبہ کے ہاتھ سے پٹ چکے ہیں۔ وزارت اور وزیری حرم سرا کے باہر ہی ہے اندر اندر تو بس بیگم صاحبہ کا جوتا ہے اور سرکار کا سر"

"لاحول ولا قوۃ۔" مصاحبوں نے دبی زبان سے کہا اور آہستہ سے محل کے بائیں باغ کا دروازہ کھول کر نکل گئے۔

چلو بھئی! ملک التجار کے یہاں چلیں۔ اس سے زیادہ خوش نصیب اس ملک میں کوئی نہیں ... ... دولت اس کی غلام ہے بادشاہ کا وہ خاص دوست ہے۔ وہ مٹی کو سونا بنا دیتا ہے۔ اہل و عیال کی پابندیوں سے بھی آزاد ہے۔ سُنتے ہیں کہ دن رات بہت پُرکیف زندگی بسر کرتا ہے۔ آؤ، ذرا اس کو جانچیں۔"

ملک التجار ابھی ابھی ہوا خوری سے واپس آئے ہیں۔ ان کی سواری کے عربی گھوڑے دروازے پر کھڑے ہوئے دُمیں ہلا رہے ہیں اور ٹاپیں مار رہے ہیں۔ چوب دار اور خدام طلا کار لباسوں میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ ملک التجار کا محل خالص مرمر کا ایک عالی شان قلعہ ہے۔ جوانی میں خوب عیاشیاں کر چکے ہیں ۔۔ اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی مے نوشی کر لیتے ہیں، اور بس ۔۔ اب تو دولت ہے اور وہ ہیں۔ دُنیا کی کوئی فکر نہیں۔

"آغا صاحب! ذرا ہماری اطلاع کرا دیجئے۔"

"اجی رہنے بھی دو، اس وقت ملاقات کر کے کیا کروگے۔ سیٹھ صاحب صبح سے بہت پریشان ہیں۔ رات ان کا بھانجا ایک قیمتی ہیرا چرا کر چلدیا۔ صبح سے سیٹھ اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہوا خوری کیسی؟ بدحواس ہو رہے ہیں۔ دنیا بھر میں اس کمبخت کو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ دو چار دن میں رو دھو کر بیٹھ رہیں گے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ان کے جواہر خانے کا کیا کہنا۔ ہزاروں ہیرے پڑے دمک رہے ہیں۔ ایک ہیرا نہیں نہ سہی۔ مگر ان کو سمجھائے کون۔ ایک ذرا سا ہیرا کیا گیا۔ گویا جان نکل گئی۔ بھل بھل رو رہے ہیں۔ عورتوں کی طرح ٹسوے بہا رہے ہیں۔ چھ پہر ہو گئے ایک کھیل بھی منہ میں اڑ کر نہیں گئی۔ یہ حال ہے جیسے کسی کا بیٹا مر گیا ہو۔"

"لیجئے معلوم شد بافندگی!" جہاں پناہ کے مصاحبوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"نہیں بھائی دنیاداروں کو چھوڑو! ادھر تو عیش کا کوئی نام نہ ملے گا۔ جس پر نہ ہو، دولت کا سگا بھائی غم ہے۔ یہ چیز جو ہم ڈھونڈھ رہے ہیں ملے گی تو دینداروں ہی میں ملے گی۔ چلو مفتی صاحب کی طرف چلو۔"

مفتی صاحب بادشاہ کی سلطنت کے سب سے بڑے مفتی ہیں۔ علوم و فنون کی دولت وہ مکہ اور ازہر سے لیکر آئے تھے۔ زہد و اتقا ان کو ورثاً اپنے باپ دادا سے ملا تھا۔ شریعت اور سنت کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ مفتی بھی تھے اور شاہی مسجد کے پیش امام بھی۔ سلسلہ نقشبندیہ اور قادریہ میں بیعت بھی لیتے تھے۔

ملک کی آدھی آبادی ان کی مرید تھی۔ ہزارہا عقیدتمند ان کی صحبتوں میں حاضر ہو کر فیض حاصل کرتے تھے۔ اور عرفان کے خزانوں سے دامنِ مُراد بھر کر لے جاتے تھے۔ دُور دُور اُن کی پاک نفسی کا شہرہ تھا۔

اس وقت وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر صحنِ مسجد میں تشریف رکھتے ہیں۔ مُریدین کا حلقہ قائم ہے۔ جیسے شمع کے چاروں طرف پروانے۔ مفتی صاحب ابھی وظیفہ سے فارغ نہیں ہوئے ہیں۔ بادشاہ کے مصاحبین کو آتے دیکھ کر مریدین نے زانو بدلے۔ آنے والوں کے لئے حلقہ کی اگلی صف میں جگہ چھوڑی گئی۔ بادشاہ کے مصاحب خدا کے گھر میں بھی اگلی صف کے حقدار ہوتے ہیں۔

آنے والوں نے اپنے دل میں سوچا "اللہ اللہ! ان سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا۔ دنیا میں یہ احترام اور عاقبت میں روضۂ رضوان۔ ان کے لئے یہ دونوں جہان میں خوشی ہی خوشی ہے۔"

مفتی صاحب کا وظیفہ ہنوز ختم نہ ہوا تھا۔ کہ ایک خادم گھر کی طرف سے بھاگا ہوا آیا۔

"حضرت۔" اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ ذرا مکان تشریف لے چلیئے۔ پولیس والے چھوٹے میاں کی لاش لیکر آئے ہیں۔"

"کیا کیا، کیا کہا۔ چھوٹے میاں، کون چھوٹے میاں۔ لاش، کیسی لاش۔ کیا کہا۔ پولیس والے۔ لا الہ اللہ۔"

مریدوں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر سنبھالا۔ مشکل سے مفتی صاحب گھر پہنچے۔ پولیس کے آدمی دروازے پر بیٹھے تھے۔ مفتی صاحب کو سوال کا ہوش کہاں تھا۔ مگر

مریدوں کو پولیس والوں نے بتایا۔ کہ صاحبزادے ایک طوائف پر مبتلا تھے۔ اسی کے گھر زہر کھا لیا۔۔ اندر اور باہر ایک کہرام تھا۔ مفتی صاحب بیہوش پڑے تھے۔

بادشاہ کے مصاحبین اپنی آنکھوں کی نمی کو رومال سے خشک کرتے ہوئے باہر آئے۔

"یہاں بھی نہیں تو پھر کہاں ہے" انہوں نے کہا۔ وہ شے جو ہم ڈھونڈ رہے ہیں دولت کے دامن میں نہیں۔ دُنیا کے پاس نہیں مذہب کی گرہ میں نہیں۔ پھر کہاں ہے؟ دولت رونی ہے، عزت بسورتی ہے، مذہب دہائی دیتا ہے"

"پھر کہاں۔ ہے"

15.6.74

ان سب کو چھوڑو۔ اُدھر چلو۔ جدھر دنیا ہے نہ دین۔ آؤ کسی میخانے میں چلیں۔ کسی پرانے شرابی کو ڈھونڈیں۔ کوئی ایسا شرابی جس کا نشہ کبھی نہ اُترتا ہو۔ جو دنیا سے بے تعلق ہو۔ جو سارے علائق کو میخانے کے خم میں غرق کر چکا ہو۔ جس کو نہ مرنے کا غم نہ جینے کی فکر ہو۔ نہ دولت کی تلاش نہ عزت کی خواہش، نہ دوزخ کا خوف نہ جنت کی جستجو۔"

وہ دونوں مے خانے میں آئے۔ پھٹی ہوئی چٹائیوں پر ٹوٹے ہوئے مونڈھوں اور کرسیوں پر۔ یہ دونوں نہیں، فرش خاک پر۔ کوئی اکڑوں۔ کوئی دوزانوں کوئی کروٹ سے کوئی چت۔ کوئی دیوار کے سہارے کوئی کسی دوسرے کو تکیہ بنائے ہوئے میخواروں کی ایک دنیا آباد تھی۔

" لاؤ لاؤ ایک اور، ہاں ایک اور، تلخ دو، میٹھی نہیں، تیز دو ہلکی نہیں لاؤ لاؤ

بھر کے لاؤ۔ آدھا نہیں۔ گراؤ نہیں۔ ادھر لاؤ۔ پلا دو۔ ڈال دو۔ اونڈیل دو۔ لاؤ لاؤ
نشہ نشہ ہے نشہ کہاں ہے۔ کس کو ہے؟ کیا کہتے ہو؟ میں سو گیا۔ غلط ہے۔ خدا کی قسم
غلط ہے۔ میں نشہ میں ہوں۔ یہ بھی غلط ہے۔ نعوذ باللہ افترا ہے۔ کذب ہے۔ موت،
موت کیسی؟ ایک پیالہ میں زندگی ہے۔ ہاں وہ بھرا نہ ہو تو موت زندگی کو بھول جاؤ۔
موت کو یاد نہ کرو۔ لاؤ لاؤ — دوزخ جنت؟ یہ کیا خرافات ہے۔ ہم جنت والے
دوزخ کو کیا جانیں۔ جنت والوں سے دوزخ کا ذکر۔ کیسے بیوقوف ہو؟ لاؤ لاؤ۔ بیمار
ہیں؟ کون بیمار ہیں؟ بادشاہ سلامت بیمار ہیں؟ کیوں بیمار ہیں؟ بیمار ہونے کو کس نے
کہا تھا۔ کھول دو ایک قرابہ۔ پلا دو ایک مشک بھر کے اچھے ہو جائیں گے۔ جاؤ کہو اچھے
ہو جائیں گے۔ بستر سے اٹھیں گے جوان ہو کر۔ حکیم صاحب سے کہو۔ خوب پئیں اور
پلا دیں۔ اتنی پلائیں اتنی پلائیں!!! — مفتی صاحب کا کیا ذکر؟ یہاں دیکھو کتنے مفتی
موجود ہیں۔ ہم سب مفتی ہیں اور ہم میں سے ہر ایک بادشاہ ہے — بادشاہ —
جہاں پناہ — لاؤ لاؤ۔

"اندر آؤ۔ مسرت کا ٹھکانا مل گیا۔ منزل مراد یہی ہے۔ دونوں کی امیدیں
ہم آواز تھیں۔ جو شے کہیں نہ مل سکی وہ یہاں موجود ہے۔ ان میں سے کسی کی قیمت
حاصل کرنی چاہیے۔ وہ میخانے کے ایک گوشے میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے۔"

ایک شخص مجمع سے ذرا بچا ہوا ایک چٹائی پر بیٹھا ہنس رہا تھا۔ ہاتھ میں اس
کے ایک صراحی تھی۔ جھوم جھوم کر صراحی سے ایک ایک گھونٹ پیتا تھا۔ مسکراتا تھا صراحی
کو کلیجہ سے لگا کر ہنستا تھا۔ دونوں نے کہا۔

"آؤ اس شخص سے باتیں کریں۔"

"آپ کون ہیں کہاں رہتے ہیں، کیا شغل ہے" انہوں نے مسکراتے ہوئے شرابی سے سوال کیا۔

"میں کون ؟ شرابی، میرا گھر شراب خانہ، میرا شغل شراب نوشی۔ میری زندگی شراب، میری دنیا شراب، میری عقبیٰ شراب! اور کیا پوچھتے ہو؟ آؤ دو گھونٹ پی لو۔

"تم اس حال میں خوش ہو ؟" دونوں نے سوال کیا۔

"خوش ؟ یہ کس زبان کا لفظ ہے" شرابی نے کہا "پیسہ میری جیب میں نہیں مفت کا ایک قطرہ مجھے مل نہیں سکتا۔ چار چار دن محروم رہتا ہوں۔ پیاس نہیں بھرتی مگر اس مے خانہ سے نکالا جاتا ہوں۔ خوش ؟ ---- کاش میرے پاس کچھ دولت ہوتی۔ اتنی تو ہوتی کہ ہر روز پی لیا کرتا۔ اس شہر کے دولت مند سونے چاندی کے ڈھیر مٹی کے نیچے دبائے بیٹھے ہیں۔ اللہ نے اپنی نعمتیں کس قدر غلط تقسیم کی ہیں۔ ہم بھی اسی کے بندے کہلائے جاتے ہیں۔ ان کو اتنا کچھ اور ہم کو کچھ نہیں۔ ایک قدح شراب کے قابل بھی نہیں۔ وہ پھولوں پر سوئیں ہم کانٹوں پر لوٹیں۔ خدا اسی کو کہتے ہیں جو ایک کو دے اور دوسرے کو نہ دے۔ مالک، خالق، معبود، شکوہ کرنا کفر ہے۔ شکایت کرنا گناہ ہے ---- خوش !،

جاؤ جاؤ۔ ہٹو۔ میرا مذاق اڑانے آئے ہو۔ پیتے نہیں۔ پلاتے بھی نہیں، اترانے پھرتے ہو۔ دھوکا دینے آئے ہو۔ میری مفلسی مجھے یاد دلانے آئے ہو۔ مجھے ترسانے، تڑپانے۔ ہٹو ہٹو ---- ارے لاؤ لاؤ ایک جام لاؤ۔"

"بس کیا دیکھنے آئے تھے کیا دیکھا۔ شراب کی مستی اور کیف کہاں۔ وہ تو دولت کا ماتم کر رہا ہے۔ مسرت کو وہ بد نصیب کیا جانے۔ دور سے پھول نظر آتا ہے۔ نزدیک

جاؤ تو کانٹے ہی کانٹے ہیں! زندگی کے ریگستان میں کیا سب سراب ہی سراب ہیں؟" وہ دونوں مایوس اور حیران مے خانے سے نکلے۔

اب کدھر چلیں؟ شہر تو دیکھ لیا۔ چلو جنگل کی طرف چلیں۔ کیا معلوم پہاڑ کی کسی گھاٹی میں، جنگل کے کسی گوشے میں۔ خدا کا کوئی بندہ، جیسا ہم ڈھونڈ رہے ہیں مل جائے۔"

ہفتوں وہ جنگلوں اور بیابانوں میں گھوما کئے۔ دیہات میں اور بستیوں میں دریاؤں کے کنارے، مسجدوں اور مندروں میں، پہاڑوں کی گھاٹیوں میں وہ ڈھونڈتے پھرے۔

ایک دن ایک گاؤں کی آبادی کے باہر ایک کچی سڑک کے کنارے ایک برگد کے سایہ میں انھوں نے ایک جھونپڑی کے سامنے ایک نوجوان فقیر کو بیٹھے دیکھا۔ دوپہر کا وقت تھا، گرمی سخت تھی۔ لُو چل رہی تھی۔ اکّا دُکّا مسافر جو اس راستے سے گذر رہے تھے جھونپڑی کے سامنے کچھ دیر دم لیتے تھے۔ فقیر ان کو پانی پلاتا تھا۔ اپنی جھونپڑی میں سے کچھ بھنے ہوئے چنے لاتا اور ان کے سامنے پیش کرتا تھا۔ وہ کچھ کھاتے تھے۔ دو گھونٹ پانی پیتے تھے۔ کچھ ستاتے اور روانہ ہو جاتے تھے۔ اس نوجوان فقیر کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ اس کے چہرے پر ایک نور تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک کیف تھا۔ دونوں مصاحب گرمی اور لُو کی تکلیف سے تنگ آ چکے تھے۔ درخت کے ٹھنڈے سایہ اور فقیر کی شگفتہ صورت نے ان کے قدموں کو جھونپڑی کے سامنے روک دیا۔ فقیر کے مٹکے کا ٹھنڈا پانی۔ برگد کی چھاؤں اور جنگل کا سناٹا یہ سب چیزیں ایسی تھیں کہ وہ دونوں مسافر ستانے کیا بالکل ہی بیٹھ گئے۔ فقیر سے انھوں نے اجازت چاہی کہ دوپہر ڈھلنے تک وہ جھونپڑی کے پاس آرام کر لیں۔ لیٹے لیٹے انھوں نے فقیر سے باتیں شروع کیں۔ "کیوں

بابا تم کب سے اس جھونپڑی میں رہتے ہو۔؟"

"جب سے میں پیدا ہوا، اور میں پیدا اس وقت ہوا جب دنیا کی خواہشیں میرے دل میں مر گئیں۔ ان کی موت میری زندگی ہے۔" فقیر نے کہا۔

"اب تم کیا کرتے ہو؟"

"مسافروں کی خدمت کرتا ہوں اور اس جھونپڑی میں پاؤں پھیلا کر سوتا ہوں۔" فقیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تمہیں کوئی فکر نہیں، کوئی تکلیف نہیں۔" دونوں مصاحبوں نے زیادہ دلچسپی کے ساتھ پوچھا۔

"فکر خواہش کی ماں ہے۔ اس کے بطن سے یہ تکلیف دہ بچہ پیدا ہوا کرتا ہے۔ میں خواہش نہیں رکھتا۔ پھر میرے گھر میں فکر کہاں سے آئے۔؟"

"تم اپنی زندگی میں مطمئن رہو، آرام سے ہو؟"

"میں مطمئن ہوں، خوش ہوں۔ آرام سے ہوں۔ میرا کسی ایسی چیز سے واسطہ ہی نہیں جو غیر مطمئن ناخوش یا بے آرام ہو۔"

"خدا کا شکر ہے، ہم نے تم کو پالیا۔" دونوں بول اٹھے۔ "ہم کو تم ہی جیسے انسان کی تلاش تھی۔" پھر انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ "بادشاہ بیمار ہے اس کے علاج میں تمہاری امداد کی ضرورت ہے۔" فقیر سنتا رہا۔ سن کر بھی خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"بابا میں بادشاہوں کو کیا جانوں۔ میں جس دنیا میں ہوں وہاں بادشاہ ہوتا ہی نہیں۔ خیر! تم کہو، تم کیا چاہتے ہو۔؟"

"تم بادشاہوں کی نہ سہی۔ انسانوں کی خدمت تو کرتے ہو تو ہماری کچھ امداد کرو۔"

"ہاں!" فقیر نے کہا۔ "جو کچھ میرے پاس ہے۔ خوشی کے ساتھ تم کو دے سکتا ہوں۔ تمہارے کام آئے تو میری جھونپڑی اٹھالے جاؤ۔"

خوش ہو کر دونوں نے کہا: "بس ہمیں اپنی پھٹی پرانی قمیص دیدو۔"

"برسیں ہوئیں میرا جسم قمیص سے ناآشنا ہے۔ دنیا چھوڑی۔ دنیا والوں کا لباس چھوڑا۔ میرے جسم کی کھال میرا لباس ہے شاید اسی لئے میں مطمئن بھی ہوں۔ بابا! قمیص میرے پاس نہیں!"

بادشاہ اب تک بیمار پڑا ہے۔ مصاحبین ملکوں ملکوں ڈھونڈ آئے۔ کوئی ایسا نہ ملا جس کی قمیص بادشاہ کے مرض کا علاج ہو اور ایک جو ملا۔ اس کے جسم پر قمیص ہی نہ تھی۔

۱۹۴۳ء

دیوتاؤں کا صدقہ

اشخاص :-

کلاڈیس بالبو	ایک رومی امیر جو اپنی بیوی کی بدچلنی سے واقف ہے
لینڈولس	روما کا ایک نوجوان امیرزادہ جس سے بالبو کی بیگم کے ناجائز تعلقات ہیں۔
جولیا	بالبو کی بدچلن بیوی۔
گالبا	بالبو کا سیکریٹری
لوکسٹا	بالبو اور جولیا کی کنیز جو زہر دیکر قتل کرنے کے فن میں دستگاہ رکھتی ہے۔

منظر

دوپہر ڈھل چکی ہے، آفتاب کی تمازت کم ہوتی جاتی ہے۔ کلوزیم کی دیواروں کا سایہ لمبا ہوتا جاتا ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے یہ وقت ہے جب روما کے رؤسا اور امراء اپنے محلوں کے برآمدوں میں نکل آتے ہیں

کلاڈیس بالبو کا محل بنیاد سے گنبد تک خالص مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اس محل کے

(ایک برآمدہ میں بابلو اپنی بیگم کے عاشق لینڈلس کے ساتھ پانسو کا کھیل کھیل رہا ہے یہ دونوں مرمر کی نیچی چوکیوں پر رکھے ہوئے ریشم کے موٹے گدوں پر کچھ بیٹھے اور کچھ لیٹے ہوئے کھیل میں مشغول ہیں۔)

بَالبُو:۔ کھیلو۔ کھیلو، پانسہ پھینکو، پانسہ کو روکتے کیوں ہو۔ کس چکر میں ہو؟ (آنکھ مار کر اور سر ہلا کر محل کے دروازے کی طرف دیکھتا ہے)

لینڈلس:۔ "ہوں۔ کیا کہا، ؟ پانسہ ؟ پانسہ تو پھینک رہا ہوں، یہ دیکھو، یہ مارا، لو چلو اُٹھاؤ پانسہ۔"

بَالبُو:۔ "(ایک ہونٹ دانتوں کے نیچے دبا کر) تمہارا پانسہ تو سیدھا پڑ رہا ہے۔ مگر کب تک ؟ ایسا لوٹے گا کہ یاد کرو گے۔ پانسہ کے بھروسہ پر نہ رہنا۔ میرا ہاتھ ابھی نہیں دیکھا۔"

لینڈلس:۔ "اجی سب دیکھ لیا۔ دیکھ چکے تمہارا ہاتھ! (پانسہ پھینک کر) پانسہ یوں پھینکتے ہیں، دیکھا۔ ؟ اب ذرا سنبھل کر پھینکو۔

(اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے۔ دل ہی دل میں باتیں کرتا ہے۔ بانسہ پانسہ سیدھا پانسہ تو میرا ہے۔ اس گدھے کا پانسہ تو اُلٹا پڑ چکا۔ نِرا اُلّو کا پٹھا ہے۔ جورو کو میں لئے جاتا ہوں شوہر آپ ہیں! دیوتاؤں کی دِلگی بھی عجیب ہے۔ جولیا جیسی پری کا جوڑا لگایا بھی تو اس لنگور کے ساتھ! واہ میرے دیوتاؤ۔)

بالبو:۔ "کیا منمنا رہے ہو، لو پھینکو آخری ہاتھ۔"

(جولیا محل کا پردہ اٹھا کر آتی ہے۔ اس کا لباس بھی اتنا ہی حسین اور

دلکش ہے۔ جسقدر وہ خود حسین ہے۔ رخسار اور ہونٹ غازہ کی سُرخی سے
گلاب کی طرح سُرخ ہیں۔ اس کے جسم پر جواہرات جگمگا رہے ہیں)

جولیا (بالبو کی طرف مُنہ بنا کر) "لینٹولس سے پانسے پھنکوا رہے ہو۔ اور تمہیں خبر نہیں کہ وہ مجھے ساتھ لیکر اس وقت کلوزیم جانے والا ہے۔ تم کو تو پانسہ پھینکنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں، اور جب پھینگو گے اُلٹا۔

بالبو:۔ "بیگم صاحبہ! معاف فرمایئے (مُنہ بنا کر) مجھے کیا خبر تھی کہ لینٹولس کو ساتھ لیکر آپ تماشہ دیکھنے جا رہی ہیں۔ لے جایئے، لے جایئے (لینٹولس سے) "جایئے جناب، جایئے۔ تشریف لے جایئے، مہربان، بیگم صاحبہ کو کلوزیم کا تماشہ دکھانے لے جایئے۔ (ذرا گرم ہو کر) "جاؤ، تم دونوں جاؤ۔ میں کب کہتا ہوں کہ نہ جاؤ۔ ایسے ایسے جاؤ کہ پھر واپس بھی نہ آؤ۔"

جولیا۔ (جاتے جاتے رک کر) کیا فرمایا۔ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو؟ نہیں چاہتے کہ واپس آؤں۔ تو پھر قصہ ختم کرو۔ میرا مہر مجھے دو۔ پورے دو لاکھ جیب سے نکالو۔ میں کب تم جیسے گدھوں کے اصطبل میں رہنا چاہتی ہوں ــــ مگر جاؤں گی اپنا مہر لیکر ــ اور تمہاری صورت کو آگ لگا کر! (زور سے دروازہ بند کرتی ہے اور محل سے نکل جاتی ہے۔)

بالبو۔ (سخت غصہ کی حالت میں ٹہل رہا ہے اور بڑبڑاتا جاتا ہے۔) "دیکھوں گا، دیکھوں گا سمجھوں گا! طلاق لیگی!؟ مہر لیگی!؟ تو اور تیرا لینٹولس (دروازے کی طرف مُکا دکھاتا ہے) لے! مجھ سے اپنا مہر لے اور لینٹولس کی بغل میں چین کر! (آواز دیتا ہے) "گلبا۔ گلبا ــــ"

(گلبا داخل ہوتا ہے۔)

بالبو۔ "جاؤ ان دونوں کے پیچھے جاؤ۔ لوکسٹا کو بلاؤ۔ اس سے کہو کہ جس وقت یہ دونوں واپس آئیں تو ان کے لئے تیز شراب کا ایک آخری جام تیار رہے۔ سمجھ گئے میرا مطلب!"

(گلبا جاتا ہے اور بالبو کمرے میں بڑبڑاتا ٹہل رہا ہے)

بالبو۔ طلاق، مہر، لینٹولس کی معشوقہ، لوکسٹا کی شراب پی، ایک جام پی لے، میری پیاری بیگم! بیگم صاحب کی عمر کا پیالہ چھلکنا چاہیئے۔ آج رات کے کھانے کے بعد، ناہید دیوتا کی قسم میں بغیر جولیا کا مہر ادا کئے انگیر پینا سے شادی کر سکوں گا۔ دیوتاؤں کا صدقہ!"

دوسرا سین

(محل کے باہر سڑک پر)

لینٹولس:۔ "کیوں جان من! وہ حلوہ بھی تیار کر لیا۔ جو آج شب کو بالبو صاحب نوش فرمائیں گے۔

جولیا (مسکرا کر) نہیں۔ مگر میری کنیز لوکسٹا تیار کر رہی ہے۔ مطمئن رہو۔ وہ اپنے فن کی ماہر ہے۔ ناہید دیوتا کا سایہ ہم دونوں کے سر پر ہے۔ حلوہ بہت میٹھا ہے۔ بہت مزے کا ہوگا۔ میں نے لوکسٹا کو سمجھا دیا ہے۔ کہ شکر زیادہ ڈالے۔

میرے عزیز شوہر حلوہ کھا کر سو رہیں گے! نہ طلاق! نہ مہر! بس لوکسٹا کا حلوہ میرے معزز شوہر کے حلق میں! دیوتاؤں کا صدقہ!" "پردہ"

ڈپٹی صاحب کا کتا

داروغہ جی محلہ کی سڑک پر خراماں خراماں تشریف لے جا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بید کا ٹکڑا ہے۔ جس کی دم میں چمڑے کے کٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ وہ اس کو اس طرح ہلاتے اور گھماتے چلے جاتے کہ چمڑے کے ٹکڑوں کا ایک پھول ہوا میں بن جاتا ہے۔ سیاہ فام چہرے پر گھنی مونچھوں سے ڈھکے ہوئے موٹے موٹے لب ہیں۔ جس کی گرفت میں ایک سلگتا ہوا سگریٹ ہے۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے وہ ہر طرف دیکھتے جاتے ہیں۔ گویا محلہ کے ہر در و دیوار پر اور ہر دروازے میں انہیں ایک چھپا ہوا چور نظر آنے والا ہے۔

سڑک پر کھیلتے ہوئے بچے داروغہ جی کو دیکھ دیکھ کر اپنے اپنے گھروں کے دروازوں کی طرف بھاگنے لگے۔

محلہ کی پنہاریوں نے راستہ چھوڑ کر اپنے گھونگھٹ لمبے کر لئے۔ اس طرح داروغہ جی محلہ میں شام کا پہرہ لگا رہے ہیں۔

"کیوں بے دیکھتا نہیں سالے۔!"

بھنگی نے جھاڑو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے سلام کیا۔ داروغہ جی نے جیب سے رومال نکال کر اپنی ناک کو لگایا۔ تاکہ سڑک پر بھنگی کی جھاڑو سے جو خاک اُڑ رہی تھی وہ ان کی سریع الحس ناک میں نہ داخل ہونے پائے۔

"خاں صاحب! ہم نے دیکھتے ہیں تمہارے ہاں اب تاش بہت کھیلا جاتا ہے۔"

خاں صاحب معہ اپنے احباب کے گھبرا کر چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آیئے داروغہ جی آیئے۔ حقہ تو پی جایئے۔"

"کیوں جی گیہوں کا بھاؤ پھر تم نے بڑھا دیا۔"

بنیا دکان سے اتر کر سڑک پر آ گیا۔

"نہیں تو ہجور!" اس نے گڑگڑا کر کہا "بھلا سرکاروں کے لئے بھاؤ تاؤ کیا۔"

"ادھر آبے!" داروغہ جی نے ایک لونڈے کو جو گائیں ہکالے لئے جا رہا تھا بلایا۔

دیکھ! تیرے گھر تازہ مکھن ہو تو اپنی ماں سے کہنا۔ ایک پاؤ بھر تھانہ میں پہنچا دے۔"

....

داروغہ جی اپنے چمڑے کا ٹکڑا گھماتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ نان بائی کی دکان کے سامنے ایک کتا بیٹھا ہوا تھا۔ کیا جانے کیا سمجھ کر وہ بھونکنے لگا۔

"کیوں بے۔" داروغہ جی کتے سے مخاطب ہوئے۔ "بہت دانت نکالتا ہے" ایک چابک لگا کر!

"اور لے گا۔؟" محلہ والوں کی طرف مخاطب ہو کر۔ "کیوں جی! تم ان کٹکھنے کتوں کو مارتے بھی نہیں۔ عجیب لوگ ہیں اس محلہ کے۔ کیوں جی! معلوم ہے قانون کیا کہتا ہے۔؟ قانون کہتا ہے کہ کاٹنے والے کتے کو فوراً مار دینا چاہیئے۔ مار تو ذرا دو لاٹھیں اس مرندود کے! بھونکے جاتا ہے بھونکے جاتا ہے۔"

دو ایک دوڑ پڑے۔ کتے کا پٹا پکڑ کر اس کو دھپانا شروع کیا۔ کتا ٹیاؤں ٹیاؤں کر رہا ہے۔ داروغہ جی نے اپنا چمڑے کا ٹکڑا بغل میں اور سگریٹ منہ سے

نکال کر انگلیوں میں دبا لیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں روشنی بڑھ گئی ہے۔

"مارو سالے کو! بہت گلا پھاڑتا ہے، موذی ہے سالا۔"

"اب تو محلے کے بچے بوڑھے۔ جوان سب ہی سمٹ آئے۔ دکاندار بھی اپنی دکانوں کے تختے سے اٹھ کر سڑک پر آ گئے۔ داروغہ جی کے حکم سے کتا پٹیا جا رہا ہے۔

محلہ کے دوسرے سرے کے دکان پر ایک جوان بھی بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اُس نے جو سُنا کہ داروغہ جی محلہ میں آ گئے تو وہ بھی اپنی پیٹی کمر میں اور صافہ سر پر درست کرتا ہوا اُٹھا۔ محلہ والے جمع ہیں۔ داروغہ جی پہلا سگریٹ ختم کر کے دوسرا سُلگا رہے ہیں اور کتا پٹ رہا ہے:

کتا چھوٹی نسل کا بھورے بالوں والا۔ خاصا خوبصورت کتا تھا۔ کبھی نان بائی کی دُکان کے سامنے آ جایا کرتا تھا۔ مزاج کا ذرا اکڑ والا تھا اور کمبخت کو داروغہ اور غیر داروغہ کی پہچان نہ تھی۔

اس وقت اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ دُم ٹانگوں کے اندر مُڑ کر گویا چپک گئی تھی۔ زبان ایک انچ سے زیادہ باہر نکلی ہوئی تھی، اس کا ہر انداز رحم طلب تھا۔

"یہ کتا کہیں چھوٹے صاحب کا نہ ہو،" کانسٹبل نے داروغہ کے کان کے قریب مُنہ لا کر کہا۔

"ارے کس کا ہے یہ کتا؟" داروغہ جی نے محلہ والوں سے سوال کیا۔ مار پیٹ اب بند ہو گئی۔

شیخ جی! جو ابھی شور پکار سُن کر مسجد سے نکلے تھے ۔۔ دبی زبان سے کہنے لگے۔

" یہ کتا تو صاحب میرے، وہی نا، جو نئے ڈپٹی صاحب آئے ہیں، اُن کا معلوم ہوتا ہے۔"

ایک لونڈا بول پڑا۔

" دیکھا تو انھیں کے دروازے پر ہے داروغہ جی۔"

داروغہ جی نے سگریٹ کی جلتی ہوئی دُم نالی کی طرف پھینک دی۔ کچھ کھانسے۔

" بھئی کتا تو اچھی نسل کا ہے۔ ہو نہ ہو ڈپٹی صاحب ہی کا ہوگا۔ ذرا ادھر تو لاؤ اس کو۔"

کتے کے سر پر انھوں نے ہاتھ پھیرا۔

" اچھا کتا ہے۔ نئے ڈپٹی صاحب آدمی شوقین ہیں۔"

پھر کتے کے سر پر تھپکی دی۔ وہ مانوس نہیں ہوتا۔ دُم اس کی ابھی تک ٹانگوں کے اندر ہے۔ اب وہ چیختا تو نہیں، مگر غرائے جاتا ہے۔

" مزاج کا ذرا گرم ہے یہ کتا۔ یہی تو علامت ہے اس بات کی۔ کہ اچھی نسل کا ہے"
یہ کہکر داروغہ جی نے محلہ والوں کی طرف دیکھا۔ گویا اپنی پہچان اور شناخت کی داد چاہتے ہیں۔ کلو نان بائی اپنی دکان کے تختے پر سے پکارا۔

" اجی نہیں داروغہ جی! یہ تیسرا تو روز میری دُکان کے سامنے بیٹھا رہتا ہے بھلا ڈپٹی صاحب کا کتا ایسا کیوں ہونے لگا۔"

کسی نے جواب دیا۔

" نہیں جی پاگل ہو، اس کا پتا نہیں دیکھا۔ پالتو ہے جی۔ بازاری نہیں ہے۔"

داروغہ جی نے تیسرا سگریٹ سلگایا۔ ان کا پارہ ذرا چڑھنے لگا۔

" ارے میاں تم اتنے محلہ والے ہو، کسی کو معلوم نہیں کہ یہ کتا کسکا ہے عجیب

بنجر لوگ ہو تم! اس محلہ کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔"

"ہاں صاحب! ہاں صاحب، ہمیں معلوم ہے یہ کتا ڈپٹی صاحب کا ہے۔ تم نے ہزار دفعہ اس کو ان کی کرسی کے پاس بیٹھے دیکھا ہے۔"

"ارے میاں! تم بھی عجیب آدمی ہو خانصاحب۔" داروغہ جی نے جلدی سے فرمایا۔ "کھڑے دیکھ رہے ہو۔ کتا غریب پٹ رہا ہے، اور روکتے بھی نہیں۔ بھلا یہ کیا ظلم ہے کہ سب کے سب غریب کتے پر ٹوٹ پڑیں۔ چھوڑ دو اس کا پٹا۔ چھوڑ دو جی۔ معلوم نہیں کہاں سے گھیر گھار کر اس کو لے آئے۔ اور کہتے ہو کہ دکان کے سامنے پڑا رہتا ہے۔ معلوم نہیں تم لوگوں کو، جانوروں پر ظلم کرنے کے متعلق کس قدر سخت قانون ہے۔ ابھی چاہوں تو دو چار کا چالان کر دوں۔ غضب خدا کا، غریب کتا کس بری طرح پیٹا گیا ہے۔ تم لوگ انسان ہو یا جانور۔ بے زبان جانوروں پر ظلم! اس وقت میں نہ آگیا ہوتا تو تم لوگ تو مار ہی ڈالتے، ڈپٹی صاحب کے کتے کو۔"

کانسٹبل کی طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

"لے بھئی ذرا اٹھا تو لے اس غریب کو سنبھال کر۔ چل ڈپٹی صاحب کے یہاں پہنچا دیں۔"

محلہ والوں کی طرف رخ کر کے۔

"دیکھو جی خبردار۔ آئندہ ایسی حرکت نہ کی جائے۔ ورنہ باندھ لے جاؤں گا دس پانچ کو۔"

سُراغ رساں

اکتوبر کے مہینے کی ۶ تاریخ تھی اور سال تھا ۱۸۸۵ء شاید ۵۸ نہ ہوگا تو ۸۶ء ہوگا۔ غرض تھے گلابی جاڑے۔ ایک ذرا سی سردی تھی۔ صبح صبح تھانہ میں بھنگی جھاڑو لگا رہا تھا، اور داروغہ جی برآمدہ میں اپنے پلنگ پر آدھے لیٹے آدھے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ منہ ان کا ابھی باسی تھا۔ رات کے جمع شدہ چیپر ہنوز آنکھوں کے کویوں میں جمع تھے۔

ایک شخص بھاگتا ہوا آیا۔

"سلام داروغہ جی! غضب ہوگیا داروغہ جی، غضب ہوگیا سرکار۔"

"ابے غضب کے بچے کچھ کہتا بھی ہے، یا خواہ مخواہ چیخے جاتا ہے۔" داروغہ جی نے چڑ چڑا کر فرمایا۔

"داروغہ جی بڑا قتل ہوگیا۔ ہمارے میاں کو کسی نے مار ڈالا۔ ہائے ہائے۔"

"کون ہے تیرا میاں؟ ابے کس نے مار ڈالا؟ صاف صاف سیدھی بات کر ورنہ دوں گا ایک لات۔"

"اجی سرکار! ہمارے میاں خداداد خاں زمیندار پوکھیڑہ، کل شام تو اچھے خاصے تھے، اور اب کمرہ کا دروازہ بند ہے۔ پکارتے پکارتے میں تو تھک گیا۔ دروازہ پیٹا آواز نہیں دیں، گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔"

"ابے کہرام سے ہمیں کیا کام، مرغی کے، یہ بتا وہ رات گئے کہاں تھے؟"

"کہیں نہیں سرکار۔ اب سرکار کو تو معلوم ہی ہے، ان کا آنا جانا موہنی طوائف

کے یہاں تھا۔ وہیں سے شام کو واپس آئے تھے۔ بس پھر تو کہیں گئے نہیں، وہ تو دارو غہ جی اچھے خاصے تھے۔ ہائے ہائے۔ یہ کیا ہو گیا۔ ہائے ہائے۔"

"سن بے حرامزادہ! جو میں پوچھوں وہ بتا۔ بک بک کرے گا تو ابھی منہ ٹیڑھا کر دوں گا۔ ہاں اب بتا، کس نے قتل کیا اُن کو۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔

"اے لو سرکار! بھلا مجھے کیا معلوم؟ یہ تو سرکار آپ ہی معلوم کریں گے۔"

"کیوں بے! ہم تیرے باپ کے نوکر ہیں۔ ہم معلوم کریں گے، اور تو نہ بتائے گا۔ بتا، بول، — نہ بتائے گا؟ اٹھوں پھر میں۔؟"

"سرکار اولاد کی قسم مجھے معلوم نہیں۔"

"اولاد کا جنا! حرامی سالا! ——— ابے کوئی ہے، ذرا لے تو جاؤ اس اولاد کے جنے کو حوالات میں! اس حرامزادے کو یہ تو خبر ہے کہ اُن کے آقا صاحب قتل کر دیئے گئے۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ کس نے قتل کیا ——— ہم سے پوچھتا ہے سالا ——— ہم اُن کو بتائیں ——— بینا منشی جی ذرا ہتھوڑی سے ٹھکتی تو کر ڈالو۔ بانہ خان کے سپرد کر دو۔ وہ اس کا مزاج درست کر دیں گے۔"

مقتول زمیندار صاحب کے دروازے پر کانسٹیبل ٹہل رہے ہیں۔ دارو غہ جی وردی پہنے، پیٹی لگائے محلے کے لوگوں کے بیانات لے رہے ہیں۔

"ہاں تو مقتول شراب بہت پیتا تھا۔ موہنی طوائف سے اُس کا تعلق تھا اور بیوی سے کس بات پر اُس کا جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ ——— بتاؤ جی۔ صاف صاف کہو ——— ہاں! تو وہ موہنی کے گھر سے شام کو کس وقت آیا تھا تم نے واپس آتے دیکھا۔ کوئی سات بجے کے

فریب! ٹھیک! پھر تم سے کچھ بات کی تھی؟ بات نہیں کی؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے، جھوٹ مت بکو۔ سچ سچ بات کرو۔ شراب پیئے ہوئے تھا، نشہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ پھر تم سے بات کیوں نہیں ہوئی؟ نشہ کی حالت میں تو ضرور بات ہونی چاہیئے تھی۔ جھوٹے ہو تم — بکواس نہ کرو ——— یہ کیا بھید ہے کہ تم نے اس سے بات نہیں کی ——— اچھا مان لیا کہ اس نے بات نہیں کی۔ مگر تم نے بات کیوں نہ کی؟ تمہیں سانپ سونگھ گیا تھا؟ تمہاری زبان کو دیمک چاٹ گئی تھی؟ کیوں جی؟ نہیں بتاؤ گے؟ اچھا مجھے کبھی دیکھا ہے۔ ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکال لیتا ہوں۔ ہونہہ! جمعدار ذرا لیجاؤ اس بدمعاش کو حوالات میں ——— ہم آتے ہیں۔ ابھی ——

اب داروغہ جی نے موقعہ کا معائنہ شروع کیا۔

دوسری منزل پر وہ کمرہ تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ باہر کی طرف ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ داروغہ جی نے بہت غور سے اس کو دیکھا۔

"اگر کوئی گھر کا آدمی نہیں ہے تو وہ ضرور ادھر سے چڑھ کر داخل ہوا اور ادھر ہی سے نکل گیا۔ ذرا دیکھنا باہر کی دیوار پر کوئی نشان تو نہیں ہے۔"

دیوار پر نشان بہت تھے۔ لمبے، سیدھے، گول، ہر قسم کے نشان تھے۔

"اچھا اب دیوار کے نیچے زمین پر دیکھو۔" ڈبیا میں سے پان نکال کر کھاتے ہوئے ہدایت فرمائی۔ بارش ہو چکی تھی۔ نرم زمین پر انسان اور جانور کے قدموں کے سینکڑوں نشانات موجود تھے۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ رات میں ادھر سے آیا ——— ادھر ہی سے آیا۔ ادھر سے نہ آیا تو پھر کدھر سے آیا (داروغہ جی نے حاضرین کی طرف منہ کر کے اس سوال پر

زور دیا کہ گویا کسی نے ان کی رائے پر اشتباہ ظاہر کیا ہے) بیشک ادھر سے آیا ہوگا! مگر چڑھا کیسے ؟"

"جی صاحب، چڑھنے کا کیا ہے، چڑھ گیا ہوگا، رسی باندھ کر بانس رکھ کر" ایک محلہ والے نے لقمہ دیا۔

"پاگل ہو۔" داروغہ جی نے جھڑکا "کہیں قیاسات سے سراغ رسانی کی جاتی ہے پکے نشانات اور اشارے ملنے چاہئیں۔ اچھا اب دیکھو، یہاں قریب کوئی سیڑھی موجود ہے، یا نہیں۔"

"زمیندار صاحب کے اصطبل میں ایک بانس کی سیڑھی رکھی ہوئی ملی"

"ہاں! اب دیکھو بات سمجھ میں آئی۔ کھڑکی کھلی ہوئی، دروازہ اندر سے بند، دیوار نشان، سیڑھی موجود ـــــ قاتل کا راستہ معلوم ہوگیا!!!" داروغہ جی نے خاص کر ان صاحب کی طرف نظر کرکے فرمایا، جنہوں نے رسی اور بانس کا ذکر کیا تھا۔

"کھڑکی کھلی ملی ہوگی۔ قاتل اندر گھس آیا ہوگا۔ بھئی مقتول تو ہمیشہ کے بیٹھے ہوئے تھے ہی۔ ہم تو جانتے تھے کہ کسی دن یہ حشر ہونے والا ہے۔ عیاشی، شراب خواری، بری صحبت ہے۔"

ناصحانہ انداز میں داروغہ جی نے اپنے شانے ہلا کر افسوس کا اظہار فرمایا۔

"کیوں شیخ جی! میں کچھ غلط کہتا ہوں۔ سیدھے سیدھے چلتے تو آج اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے ہوتے ـــــ اب مرے پڑے ہیں ـــــ بھائی خدا بچائے۔"

"ہاں صاحب خدا بچائے۔" محلہ والوں نے آواز میں آواز ملائی۔

"ارے میاں! ہم سے کیا کہتے ہو ہم تو روز ایسے سینکڑوں تماشے دیکھا کرتے

ہیں۔"

کمرہ کے دروازے میں باہر سے قفل لگا کر مہر کر دی گئی۔ کھڑکی کے نیچے ایک کانسٹیبل مقرر کیا گیا اور داروغہ جی محلہ والوں کو سمیٹ کر تھانہ میں آ گئے۔ چلتے وقت مقتول کے کسی عزیز نے مقتول کی لاش اور کفن دفن کا کچھ ذکر کیا۔ داروغہ جی پل پڑے ارے میاں کچھ عقل بھی ہے۔ ابتدائی تحقیقات تو ہو لینے دو۔ ابھی جناب میں لاش کو ہاتھ بھی نہ لگانے دوں گا۔ ایسی گھبراہٹ کیا ہے۔ آخر کفن دفن تو ہونا ہی ہے اب نہیں، دس گھنٹے بعد سہی۔"

یہ کہکر داروغہ جی۔ داروغہ جی کے پیچھے چھ کانسٹیبل۔ کانسٹیبلوں کے پیچھے محلہ والے، محلہ والوں کے پیچھے محلہ کے لونڈے اور محلہ کے لونڈوں کے پیچھے محلہ کے دو تین کتے۔

" تحقیقات کی پہلی منزل ختم ہوئی۔

کھانا کھا کر، حقہ پی کر، داروغہ جی نے تھوڑا سا قیلولہ کیا۔ اس کے بعد پھر اپنی جبھے دار پگڑی سر پر رکھ کر معائنہ موقع فرمانے کی غرض سے نکلے۔ مکان کے چاروں کونوں پر کانسٹیبل کھڑے تھے۔ کمرے کے دروازہ کا تالا داروغہ جی نے خود کھولا۔ آگے آگے وہ اُن کے پیچھے جمعدار صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔

" دیکھو جمعدار۔ کوئی اندر نہ آنے پائے۔ نوجوان افسر یہی تو غلطی کرتے ہیں اکثر، کہ روک ٹوک نہیں کرتے۔ لوگ موقع واردات پر جمع ہو جاتے ہیں اور مجرم کے نشانات مٹ جاتے ہیں۔ کسی کو مت آنے دو۔"

یہ حکم دیکر داروغہ جی نے تفتیش کی دوسری منزل میں قدم رکھا۔

کمرہ کی حالت یہ تھی :-

دروازہ پر ململ کے میلے پردے۔ فرش پر ایک پرانا قالین۔ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس ایک مسہری جس کے پردے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے۔ بستر کی چادر اور تکیہ کے غلاف میلے۔ ایک کونے میں جوتوں کے چند جوڑے۔ ان پر گرد جمی ہوئی۔ مسہری کے پاس ایک چھوٹی میز پر ایک گلاس اور راکھدانی فرش پر سگرٹ بیڑوں کے بہت سے ٹکڑے تھے۔

داروغہ نے بہت احتیاط کے ساتھ بستر کی لٹکتی ہوئی چادر کو اٹھا کر مسہری کے پیچھے جھانکا۔ وہاں دس بارہ وسکی کی خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں اور ایک دو ٹوٹے ہوئے گلاس۔ پھر داروغہ جی نے کھڑکی سے جھانکا۔

بہت اونچی ہے۔ ضرور سیڑھی لگائی گئی ہوگی۔ دیکھو جمعدار انگلیوں کے نشانات، ادھر دیکھو۔ ان کیواڑوں پر۔ ان کا فوٹو لینا ہوگا۔ اور یہ بوتلیں بھی سب تھانہ لے جاؤ۔ اور یہ ٹوٹے ہوئے گلاس بھی اور یہ راکھدانی بھی اور ——— یہ تو دیکھو، قالین پر یہ دھبہ کیسا ہے؟ ہے تو سُرخی مائل، تعجب نہیں کہ خون کا دھبہ ہو، اس کو بھی لیجاؤ تھانہ۔"

" مگر۔" جمعدار نے کہا " سرکار مقتول کی لاش کہاں ہے۔؟"

" توبہ! عجب گھونگے ہو، جو بات آدمی کی سمجھ میں نہ آئے اس کا کہنا کیا ضرور ہے پہلے قاتل کا کھوج تو لگاؤ مقتول کی لاش بھی مل جائے گی۔ اور اگر نہ بھی ملے تو قتل تو قتل ہے۔ ابھی تو زندہ پکڑو۔ مردہ تو مردہ ہے اس کی فکر پھر کر لینا۔ سمجھے؟"

داروغہ جی نے بہت پُر معنی لہجہ میں کہا۔" سمجھے۔"

"لیکن سرکار" بے عقل جمعدار نے پھر کہا۔ "اگر قتل اسی کمرہ میں ہوا تو پھر لاش کہاں گئی۔"

"اونہہ! کیا کوڑھ مغز ہو، ارے بھائی قتل ہوا، یہ تو مانتے ہو نہ کہ قتل ہوا؟ اچھا اب یہ بھی مان لیا کہ اسی کمرہ میں ہوا۔ بہتر! اب یہ بتاؤ کہ قاتل کہاں گیا؟ قاتل اگر مل گیا تو مقتول کی لاش کا بھی پتہ مل جائے گا۔ اور وہ نہ ملا تو پھر لاش ملے یا نہ ملے۔ سب یکساں ہے۔ بھائی میرے! ان باتوں کے سمجھنے کے لئے تجربہ چاہیئے، تجربہ! یاد نہیں۔ پچھلے سال اس سوداگر کا قتل! لاش کو قاتل کہاں سے کہاں لے گئے تھے۔ اب تو جمعدار تم یوں سمجھ لو کہ ارتکاب جرم تو ہوا لاش نہیں ہے نہ سہی۔ البتہ یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ لاش اس کمرے میں نہیں تو قاتل ایک آدمی نہ تھا۔ کم از کم دو ہوں گے جو لاش کو اٹھا کر لے گئے .... یہ دیکھو یہ کیا ہے۔ تکیہ پر خون کا نشان —— اگر تکیہ پر خون کا دھبہ ہے تو سمجھ لو کہ سوتے میں قتل کیا گیا۔ اچھا تو اٹھاؤ یہ تکیہ بھی لو، لے چلو تھانہ کو۔"

"اس بوٹ کے تسمے کہاں ہیں —— ؟ ایک جوتے کو ٹھوکر مار کر داروغہ جی نے فرمایا۔" دونوں تسمے نکال لئے گئے ہیں —— اس سے کیا پتہ چلتا ہے۔ کچھ سمجھے جمعدار؟ پھر جمعدار کے جواب کا انتظار کئے بغیر" اگر یہ خون کے دھبے خون کے دھبے نہیں ہیں تو اغلب یہ ہے کہ جوتوں کے تسموں سے گلا گھونٹا گیا ہے —— یہ ذرا دور کی کوڑی ہے ——" داروغہ جی مسکرائے! کیوں جمعدار —— ہے پتے کی بات۔"

اتنے میں پولیس کے ڈاکٹر صاحب بھی تشریف لے آئے۔ وہ آہستہ آہستہ

کمرے میں داخل ہوئے جیسے ٹہلتے ہوئے کلب میں جا رہے ہیں۔ ایک اخبار ان کے ہاتھ میں تھا۔

"ارے میاں داروغہ جی، سُنا تم نے؟ سرحد پر جنگ شروع ہو گئی۔ بھئی یہ سرحدی پٹھان بھی بلائے بے درماں ہیں۔ اخبار کہتا کہ سرحد کی طرف فوجیں جا رہی ہیں۔ اب پھر چلے گی کچھ روز۔"

داروغہ جی کو نہ سرحاری جنگ سے کوئی دلچسپی تھی نہ سرحد کے پٹھانوں سے۔ انھوں نے سُنی اَن سُنی کر کے کہا۔

"ڈاکٹر دیکھو تو یہ خون کا دھبہ ہے نا۔"

ڈاکٹر صاحب نے جیب سے عینک کا خانہ نکالا۔ خانہ میں سے عینک نکالی۔ پھر جیب میں سے رومال نکالا، رومال سے عینک کے دونوں شیشے صاف کئے۔ اس کے بعد ناک کی نوک پر عینک کی کمانی رکھ کر قالین کی طرف متوجہ ہوئے۔

"دھبہ تو ضرور ہے۔ کچھ سرخی مائل بھی ہے۔ خون ہی ہوگا۔ ممکن ہے خون ہو۔ معلوم تو خون ہی ہوتا ہے ـــ خون ہے ـــ ضرور خون ہی ہے ـــ سُنا تم نے۔ داروغہ یار ہماری چھاؤنی سے بھی فوج جانے والی ہے اور جو کہیں ہم کو بھی حکم مل گیا تو ہو گی بڑی کوفت اور بے لطفی۔"

"اچھا فرض کرو۔" داروغہ جی نے جمعدار کو مخاطب کر کے کہا "فرض کرو یہ خون ہے تو پھر گویا یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقتول کو دو طرح قتل کیا گیا ہے۔ پہلے چھری یا کسی آلہ دھار دار سے اور پھر دی گئی پھانسی، جوتوں کے تسموں سے۔ یا یوں ہوا کہ پہلے پھانسی دی اور پھر چھری بھونک دی! ـــ اور نہیں تو پھر یا خون کا دھبہ غلطیا جتنے

کے تسموں والی بات! اس طرح گویا داروغہ جی نے اپنی قطعی رائے ظاہر فرمائی۔

" اور اگر دونوں باتیں غلط نہ ہوئیں، نہ تسمے نہ پھانسی، پھر ——— ارے یار چل بھی یہاں سے، بس ہو گئی تفتیش کا مل ——— سنتے ہیں کہ گاندھی جی نے اپنے آشرم کا سارا گھروندا توڑ ڈالا ——— ارے یار! یہ تو کچھ عجیب آدمی ہے ——— گاندھی ——— بھئی واہ ———"

" اُفوہ بکے جاتے ہو۔" داروغہ جی جھنجھلا گئے ——— معاملہ کو اُلجھاؤ مت سُلجھاؤ تفتیش کا یہی بنیادی اصُول ہے۔"

اپنی اخبار بینی کی داد داروغہ جی سے نہ پاکر ڈاکٹر صاحب نے عینک اتار کر اس کے خانہ میں رکھ لی اور خانہ جیب میں۔ اور یہ فرماتے ہوئے چل دیئے۔

" اچھا یار شام کو آئیں گے۔ لاش کا پتہ چل جائے تو ہمیں بلوا لیجیو۔"

" اس صندوقچی کو دیکھو۔ اس میں کیا ہے؟ گھڑی پُرانی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۲۰ روپے ایک انگشتری۔ تو تو بس (جمعدار کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔) یہ اُلجھاؤ تو سلجھ گیا۔ قتل کی غرض چوری نہ تھی۔ مال موجود ہے۔ اب اگر قتل کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو دشمنی۔"

داروغہ جی نے خالص منطقی استدلال فرمایا۔" یہ بات تو صاف ہے سمجھے جمعدار؟"

جمعدار نے سر ہلا کر اثبات کا اشارہ کیا۔ وہ اکثر اثبات ہی کا اشارہ کرنے کے عادی تھے۔

" اچھا جی! پتے کی باتیں تو سب معلوم ہو گئیں۔ اب ذرا دماغ پر زور دو قاتل کون ہو سکتا ہے۔؟" داروغہ جی نے اب دوسرا نکتہ حل فرمانے کی کوشش شروع

کی۔ جمعدار صاحب نے اب اپنی عقل کے پانسے پھینکنے شروع کیے۔

"سرکار مقتول کا کوئی دشمن ہی یقیناً اس کا قاتل ہے۔ جمعدار صاحب نے گویا یہ ایک بالکل نئی بات ڈھونڈ نکالی۔ پھر انھوں نے دشمنوں کی فہرست پیش کی۔

"منولال بنئے سے بہت مقدمہ بازی ہو رہی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ اپنے نوکر کو بھی۔ وہی جو اب حوالات میں ہے۔ بہت مارا پیٹا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بیوی سے بھی اَن بَن رہتی تھی۔ موہنی طوائف کے معاملہ میں خان بہادر صاحب سے بھی لاگ ڈانٹ تھی۔ اب خدا ہی جانے سرکار، ان میں سے کس نے یہ کارروائی کی" جمعدار صاحب گویا امکانات کے پورے میدان پر پھیل گئے۔

"اونہہ۔" داروغہ جی کے دل کو بات نہ جچی۔ "تم تو جمعدار بے پَر کی اڑانے لگے۔ اسے میاں اٹکل بندی سے کیا فائدہ، قدم قدم بڑھنا چاہیئے۔ قاتل کا پتہ لگانے سے پہلے پتہ لگانے کے صحیح طریقہ کا پتہ لگانا چاہیئے۔ یعنی یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ پتہ کس ذریعہ سے لگ سکتا ہے۔ ملازم کو تو میں نے بند کر ہی دیا۔ سالا پچاس جوتوں میں سب کھول دے گا۔ اور دو چار کو بند کر دوں۔ بس ان سب کا عرق نچوڑ لیجئو۔ یہ نہیں کہ کاتا اور لے دوڑی۔ ہلکی آنچ پر تفتیش کی ہانڈی پکاؤ۔ ہاں جمعدار۔"

"بجا ہے سرکار، پھر آپ کا تجربہ اور آپ کی عقل ہم جاہلوں، گنواروں کے پاس کہاں ہے۔"

بارہ دن گزرے، مقتول کی لاش کا پتہ نہیں، قاتل بھی لاپتہ ہے۔ تفتیش

جاری ہے اور داروغہ نے مسل مرتب کر لی ہے۔ شہادتیں تیار ہیں۔ ثبوت کے گواہ بھی تجویز ہو گئے ہیں۔ مجسٹریٹ سے گرفتاری کا وارنٹ مانگا جانے والا ہے۔ ہر چیز تیار ہے۔ درحقیقت سارا مقدمہ اور چالان تیار ہے۔ صرف خفیف سی کمی رہ گئی ہے کہ ابھی قاتل کا پتہ نہیں چلا۔ اس کے علاوہ غیر اہم سہی، لیکن ایک کمی یہ بھی ہے کہ مقتول کی لاش کا پتہ نہیں۔ مشتبہ اشخاص کئی ہیں۔ بحث صرف یہ ہے کہ کس کے اور کتنوں کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کرایا جائے ــــ رات کو داروغہ جی کھانا کھا کر اپنے بستر پر لیٹے ہیں۔ سامنے ایک مونڈھے پر تھانہ کے "منشی جی" اور جمعدار بیٹھے ہیں۔ تینوں کے بیچ میں ــــ اس تثلیث کا مرکزی نقطہ ــــ ایک حقہ رکھا ہوا ہے۔ گفتگو بہت رازدارانہ ہے۔

" اجی، ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ وارنٹ ہو جائے، کسی کے خلاف ہی ہو۔ مقدمہ تو عدالت میں آ جائے۔ ثبوت تو تیار ہو ہی جائے گا اور اس میں آسانی بھی بڑی ہے۔ جو کوئی اپنے گناہ کو بے گناہ کہیگا وہ عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کر دے گا ــــ کر دے ثابت ــــ ہم اگر تین ملزم پیش کریں گے، ایک اگر بری ہو گا تو دو رہ جائیں گے۔ دو اگر بری ہو گئے تب بھی ایک تو رہے گا۔"

" اور اگر تینوں عدالت سے بری ہو گئے؟" منشی جی نے لقمہ دیا۔ عدالتی کارروائیوں کے متعلق داروغہ جی کے مشیر خاص منشی جی تھے۔

" منشی جی! تم بھی کیا باتیں کرتے ہو، تین ملزموں میں سے ایک بھی مجرم ثابت نہ ہو سکے۔"

دس دن اور گذر گئے۔ داروغہ جی نے تین ملزموں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے۔ سب سے پہلے پولیس کی جماعت سوہنی طوائف کے گھر وارنٹ کی تعمیل کرنے پہنچی۔

" ارے کواڑ کھولو۔ کہاں ہے موہنی ؟ کیا کہا ؟ نہیں ہے ؟ یہاں نہیں ہے تو کہاں ہے۔ چھپ کر کہاں جائے گی حرامزادی۔ بمبئی گئی ہے۔ یہ نہ کہنا یاحج کرنے گئی ہے، بتاؤ سالو، کہاں ہے ملزمہ، ہم سے بچ کر کہاں جائے گی سسری! یہ پولیس ہے پولیس۔ ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے، ابھی حاضر کرو ملزمہ کو ــــ نہیں تو "

" سرکار! وہ تو قسم خدا کی بیس پچیس روز سے یہاں نہیں ہیں۔ بمبئی گئی ہوئی ہیں۔"

" بمبئی کی ایسی تیسی! سچ بتاؤ کہاں چھپایا ہے ــــ یوں نہ بتائے گی یہ حرامزادی چوٹی پکڑ کر لگاؤ تو ایک چانٹا۔ ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں، مجھے بھی کوئی تماشبین سمجھا ہے۔ نائکہ جی! میں تھانہ دار ہوں، تھانہ دار ــــ لینا جمعدار ذرا بڑھیا ڈھڈو کی خبر۔"

داروغہ جی ایک بید کا ٹکڑا ہاتھ میں لئے۔ سگریٹ منہ میں دبائے ٹہل رہے ہیں۔

" جیسی چاہو قسم لے لو داروغہ جی۔ موہنی یہاں نہیں ہے۔ ہاں کل آنیوالی ہے۔ وہ بمبئی سے آج چلی ہوگی۔ ہزار گواہ پیش کر دوں گی۔ اُس کو گئے تو بیس پچیس دن ہو گئے۔ کیوں استاد جی، کہتے نہیں ہو، تم ہی تو اُس کو پہنچانے اسٹیشن گئے تھے ــــ اور داروغہ جی آپ سے کیا پردہ ہے۔ آپ جا کر پوچھ نہ لیجئے وہ تو

خاں صاحب کے ساتھ گئی ہے۔"

"کون خانصاحب! بتا حرامزادی کون خانصاحب۔" ہم نہیں جانتے کون خانصاحب! ملزمہ کو حاضر کر۔"

"ارے وہی خانصاحب! داروغہ میاں، انھیں کون نہیں جانتا؟ وہی ناپتوکھیڑہ کے زمیندار خداداد خاں! ۔۔ کیوں استاد جی تم نے تو دونوں کو ریل میں سوار ہی کرایا تھا۔"

اس شب کو داروغہ جی نے اپنے روزنامچے میں کیا لکھایا اور منشی جی نے کیا لکھا، ہمیں معلوم نہیں۔ تفتیش بہرحال نامکمل ہی رہی۔

سزائے موت

بادشاہ خودمختار مگر نرم دل تھا۔ انصاف اور عدل کے اصول مستحکم مگر سخت گیر نہ تھے۔ سخت سے سخت شاہی احکام میں رحم کی گنجائش اور لچک باقی رہتی تھی۔

اس ملک میں کبھی کسی نے سزائے موت کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نہ کبھی کوئی شخص قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ قانونی سزاؤں میں انتہائی سزا جلاوطنی کی تھی۔ وہ بھی شاذونادر، دس بیس برس میں کسی ایک مجرم کو ایک دفعہ لیکن اس انتہائی سزا میں بھی رعایت اور رحم کی لچک باقی رہتی۔ فرض کیجئے کہ بادشاہ نے زید کو ملک بدر کر دیا۔ زید وطن سے دور کیونکر رہ سکتا تھا، وہ کچھ روز وطن کی سرحد کے پاس آوارہ گردی کرتا رہا، پھر کچھ روز بعد کبھی کبھی سرحد کے اندر بھی آنے لگا۔ دو چار فرلانگ سلطنت کی حدود کے اندر چلا پھرا اور واپس ہو گیا۔ پولیس کا بھی کچھ خوف نہ تھا۔ چوکیداروں کا بھی کچھ اندیشہ نہ تھا (فوج اس ملک میں نام کو نہ تھی فوج کی ضرورت نہ تھی۔ چوکیدار اور پولیس کے سپاہی قانون کے محافظ تھے) اور بس! کچھ روز آوارہ گردی کے بعد زید کو کسی نے نہ ٹوکا تو وہ دارالسلطنت کے اندر بھی آنے جانے لگا۔ کبھی کسی قہوہ خانہ میں جا بیٹھا، کبھی باغ عامہ میں چہل قدمی کی۔ کون جانے کون ہے۔ مگر ایک دن باغ عامہ کے دروازہ پر ایک پولیس افسر نے پہچان لیا۔ راستہ روک کر اس نے کہا۔

"جناب من! آپ تو شاید ملک بدر کئے جا چکے ہیں؟"

"جی ہاں! مگر میں صبح ہی تو آیا تھا اور شام کو ضرور چلا جاؤں گا۔"

"ہاں! یہ صورت ہے ——— تو کچھ حرج نہیں۔"

عمر بھر زید یوں ہی پولیس والوں سے صبح کا آنا اور شام کا جانا بیان کرتا رہا۔ جلاوطنی کا حکم بھی اس کے خلاف قائم اور حکم شاہی کا احترام بھی باقی رہا۔ زید کی آزادی میں بھی کوئی مداخلت نہ ہو سکی۔

مگر ایک دفعہ بادشاہ کے ملک میں ایک سخت حادثہ پیش آیا۔ ایک بہت ہی سخت حادثہ جیسا کہ پہلے کبھی پیش نہ آیا تھا۔ یعنی بادشاہ کی رعایا میں سے ایک نے اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا ایسا واقعہ اس ملک کے باشندوں نے کبھی پہلے نہ دیکھا نہ سنا تھا۔ عدالت میں ہزارہا اشخاص کا مجمع تھا۔ ملزم کے خلاف عام طور پر نفرت کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ عدالت کے جج صاحبان سخت غصہ اور رنج کی حالت میں مقدمہ کی سماعت کے لئے اپنی کرسیوں پر آ کر بیٹھے۔ بادشاہ بھی اس حادثہ کی وجہ سے بہت مغموم تھا۔ ججوں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ خون کا بدلہ خون ہونا چاہیئے، نہ ایسا جرم کبھی کسی نے سنا تھا نہ ایسی سزا! لوگ حیران بھی تھے ناراض بھی تھے مغموم بھی تھے۔ پولیس نے ملزم کو اپنی حراست میں لے لیا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کو قتل کس طرح کیا جائے۔ سلطنت کے طول و عرض میں نہ کوئی جلاد تھا نہ کسی کو پھانسی دینا آتی تھی۔ بہت سے طویل مشوروں کے بعد وزرائے شاہی نے ہمسایہ سلطنت کو ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ پھانسی دینے کا سامان اور ایک پھانسی دینے والا بھیج دیا جائے۔ بہت سی خط و کتابت کے بعد ہمسایہ سلطنت نے آمادگی ظاہر تو کی مگر اس شرط پر کہ اس خدمت کے معاوضہ میں ایک ہزار سکے دیئے جائیں۔ جب اس کا یہ جواب موصول ہوا تو بادشاہ اور اس کے وزراء کو عرصہ تک اس سوال پر غور کرنا پڑا، لیکن کسی طرح معاوضہ

دے کر قتل کرانے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کی جان جسم سے نکالنے کے لئے ایک ہزار سکّوں کو خرچ کر دینا محض حماقت ہے۔ آخر کار ہمسایہ سلطنت سے امداد لینے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

چھ مہینے گذر گئے لیکن صاحب القتل مجرم ابھی زندہ ہے!!

پھر ایک دفعہ مجلس وزراء نے اس مسئلہ پر غور کیا، اور پھر ایک دفعہ کسی دوسری سلطنت کو لکھا گیا کہ وہ پھانسی دینے کا سامان بھیج دے، وہاں سے بھی ہزار تو نہیں مگر پانچسو سکوں کا مطالبہ کیا گیا۔ بادشاہ کے کابینہ نے پھر راتوں اور دنوں اس گتھی کو سلجھانے کے لئے اپنے دماغوں پہ زور ڈالا، آخر کار وہی فیصلہ ہوا جو پہلے ہو چکا تھا، سو روپیہ! محض ایک مجرم کا گلا دبا کر اس کی جان نکالنے کے لئے؟ کیا حماقت ہے نہیں ہو سکتا"، جب شہر میں کابینہ کے اس فیصلہ کی خبر پہنچی تو وہاں بھی ہر چھوٹے بڑے نے یہی کہا کہ "یہ نہیں ہو سکتا"!

پھر کیا ہوا؟ کم و بیش ایک سال تک مجلسِ وزراء کے جلسوں میں اس سوال پر بحث ہوتی رہی۔!

اور مجرم ہنوز زندہ رہنے پر مجبور تھا۔!

دو سال گزر گئے۔ بادشاہ اور وزراء کا ناخنِ عقل اس گرہ کو نہ کھول سکا، بالآخر حکم ہوا کہ پولیس کا سپاہی تلوار سے مجرم کی گردن کاٹ دے۔ بڑی بات یہ تھی کہ اس صورت میں سلطنت بہت سے ناواجب اخراجات سے بچ جائے گی۔ چنانچہ پولیس کے افسر کو حکم دیا گیا کہ ایک سپاہی کو اس غیر معمولی کام کے لئے نامزد کر دے۔ مگر افسر نے عذر کیا کہ اور اس کے سپاہیوں کو اس طرح تلوار استعمال کرنے کی عادت نہیں۔ افسر کا

جواب ناقابلِ جواب تھا۔

اب کیا کیا جائے؟ ہفتوں مجلس وزرا کے جلسے صبح وشام ہوتے رہے۔ مگر اس سوال کا جواب میسّر نہ آیا اور مجرم ہنوز زندگی کی امیدوں سے دور نہ موت سے قریب تھا۔

ایک دن اُن وزرا میں سے ایک نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "کیوں نہ ہم سزائے موت کو حبسِ دوام سے بدل دیں۔ تمام اراکین مجلس اس تجویز کی معقولیت کے معترف ہوئے اور بادشاہ نے بھی اس کو مناسب اور بہتر تجویز سمجھ کر منظوری دیدی مگر یہ تجویز بھی دشواریوں سے خالی نہ تھی۔

مجرم حبسِ دوام کی سزا کو پسند بھی کریگا یا نہیں؟
جیل خانہ کہاں ہے، جس میں وہ عمر بھر رکھا جائے؟
اور جیلر کا کیا انتظام ہوگا؟
اور مجرم کو زندہ رکھنے کے لئے خورد ونوش کا خرچ کون برداشت کریگا؟

سلطنت کو آج تک جیل خانہ کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ لہٰذا سرکاری جیلخانہ موجود نہ تھا، نہ جیلر تھا۔ پھر ہفتوں مشورے ہوئے اور بالآخر ایک مکان کرایہ لیکر جیل خانہ بنایا گیا۔ ایک شخص کو نوکر رکھا گیا کہ وہ جیلر بن کر قیدی کی حفاظت کیا کرے شاہی باورچی خانہ سے قیدی کے کھانے کا انتظام منظور ہوا، کہہ سُنکر قیدی کو بھی راضی کر لیا گیا کہ وہ اپنی سزا کی نوعیت بدل جانے پر نارضامندی کا اظہار نہ کرے، دو تین سال کی کشمکش کے بعد اب قیدی اپنے جیل خانہ میں آرام کی زندگی بسر کرتا تھا۔

چھ مہینے تک یہ دستور رہا کہ قیدی اپنے گھاس کے بستر پر لیٹا رہتا تھا۔ جیلر صبح آتا تھا اور دروازے پر ایک کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ شام تک یا تو قیدی سے باتیں کرتا رہتا تھا یا شطرنج کھیلتا رہتا تھا، دونوں وقت شاہی باورچی خانے کا ایک غلام قیدی اور جیلر کا کھانا پہنچا دیا کرتا تھا۔ شام کو جیلر مکان کا دروازہ بند کر کے اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اب حکام اعلیٰ کو اس قیدی کے متعلق کوئی زور باقی نہ رہا ہوگا مگر بادشاہ خود ابھی تک متردد تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ملک کے بجٹ پر اس مستقل خرچ کا بار کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے۔ قیدی ابھی نوجوان ہے سالہا سال زندہ رہے گا۔ پھر یہ مکان کا کرایہ، جیلر کی تنخواہ، قیدی کا کھانا۔ یہ تو گویا ساری عمر کا خرچ پیچھے لگ گیا اور اس میں شک نہیں کہ بادشاہ کا تردد کچھ بیجا نہ تھا۔ چنانچہ پھر ایک دن مجلس وزرا نے بادشاہ کے اس سوال پر غور کرنا شروع کیا۔ مہینوں کے بعد شاہی کونسل بالآخر اس فیصلہ پر پہنچی کہ اگر قیدی اپنی حفاظت خود کرنے پر آمادہ کیا جا سکے تو جیلر کو برخاست کر دیا جائے۔ اس کی تنخواہ بقدر اخراجات میں تخفیف ہو جائیگی یہ حسن اتفاق ہے کہ قیدی کوئی ضدی آدمی نہ تھا اس نے اپنی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی اور اب وہ تنہا اپنے جیل خانے میں صبح سے شام تک زندگی بسر کرتا تھا۔ دن میں دو دفعہ جب شاہی باورچی اس کا کھانا لیکر آتا تھا تو ایک دو گھنٹہ شطرنج کی کوئی بازی اس کے ساتھ کھیل جاتا تھا۔ کچھ عرصہ تک قیدی کی زندگی کا یہ راستہ بالکل ہموار رہا لیکن ایک دن شاہی باورچی بھول گیا یا مصروف زیادہ تھا، یا بیمار ہو گیا۔ غرض یہ کہ قیدی کا کھانا وقت پر نہ آسکا۔ بھوک نے شاہی قوانین کی پابندی سے انکار کر دیا قیدی خود ہی قید خانے سے نکل کر شاہی باورچی خانہ تک پہنچ گیا۔ جب ایک دفعہ قیدی اپنا کھانا

لینے خود جا سکتا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہر دفعہ وہی نہ جایا کرے۔ مجلس وزرا نے بھی مزید
کفایت کے اس پہلو کو پسند کیا اور اب یہ دستور ہو گیا کہ دونوں وقت قیدی خود ہی
اپنا کھانا لے آتا تھا اور رات کو قید خانہ کا دروازہ اندر سے بند کر کے سو رہتا تھا۔ کھانا
لانے اور شاہی باورچی خانے تک جانے آنے کے سلسلے میں کبھی باغ عامہ میں دو چار
گھنٹے سیر و تفریح یا کبھی کسی قہوہ خانہ میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ کا وقفہ ایک ایسی معمولی بات تھی جس کے
متعلق قیدی سے نہ کبھی باز پرس ہوئی نہ ہو سکتی تھی! وہ خود ہی اتنا ایماندار اور قانون
سلطنت کا پابند تھا کہ دن بھر باہر رہنے کے بعد بھی شب کو کبھی اپنے جیل خانے
سے غیر حاضر نہ ہوتا تھا۔ اس طرح کئی سال گذر گئے، قیدی اپنی سزا بھگت رہا تھا اور
حکومت کا ضمیر بھی مطمئن تھا کہ خطاوار کو کافی سزا دے کر قانون کی عزت برقرار
رکھی گئی۔

لیکن بادشاہ ہر سال اپنے بجٹ میں جیل خانہ کے اخراجات کی مد کو دیکھ کر
بہت متردد ہوتے تھے۔ اُن کی رائے میں جیل خانہ کا کرایہ اور خوراک کا خرچ ملک کے
بجٹ پر ایک بے جا بار تھا، رفتہ رفتہ ایک دن پھر اخراجات کا یہ سوال مجلس
وزرا کے سامنے آگیا۔ کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ قیدی کی سزا کو حبس دوام کے بجائے
جلا وطنی کر دیا جائے اور اس طرح جیل خانے کے اخراجات سے ملک کو بچانا چاہیئے۔ تجویز
معقول تھی۔ اُس پر مجلس متفق ہو گئی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ قیدی بھی سزا کی اس ترمیم پر راضی
کیا جا سکے گا، مجلس کے روبرو قیدی حاضر کیا گیا۔ اور اس کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی
— اپنی طویل مدت قید میں جب وہ تمام احکام کو اطاعت اور بندگی کے ساتھ
قبول کرتا رہا پہلی دفعہ قیدی نے وزرا کی اس تجویز پر سخت اعتراض کیا۔ اس نے کہا۔

"جناب من! آپ نے قتل کا حکم دیا۔ میں نے اعتراض نہ کیا۔ آپ نے حبس دوام کا حکم دیا۔ میں اس پر بھی رضامند ہو گیا۔ آپ نے میرے جیلر کو موقوف کر دیا، میں نے شکایت نہیں کی، آپ نے میری حفاظت کا فرض مجھ ہی پر عائد کر دیا۔ میں نے اس کو بھی گوارا کر لیا۔ پھر آپ نے مجھ کو مجبور کیا کہ باورچی خانہ سے اپنا کھانا لایا کروں، یہ بھی میں نے آپ کی خاطر منظور کیا، اب آپ مجھے ملک سے نکالتے ہیں، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے میں کھاؤں گا کیا، میری وجہ معاش کیا ہو گی؟ میں آپ کا قیدی ہوں، آپ نے مجھے قید کیا اور میں نے آپ کے تمام احکام کی تعمیل کی۔ لہٰذا اب میری پرورش آپ کے ذمے نہیں تو کس کے ذمے ہے۔؟"

قیدی نے جس قدر عذر پیش کئے سب معقول تھے۔ شاہی کونسل لاجواب ہو گئی جلسہ برخاست ہو گیا اور شاہی محل کے بڑے کمرے میں پھر عرصہ تک اس سوال پر مشورے ہوتے رہے کہ ہو تو کیا ہو، کریں تو کیا کریں۔ قیدی جلاوطنی پر رضامند نہیں ہوتا۔ قتل کیا جا سکتا نہیں، حبسِ دوام کے اخراجات بہت ہیں۔ پھر کیا سمجھوتا کیونکر ہو؟ اس وقت تک قیدی کے اخراجات کا اوسط ایک ہزار روپیہ سال کے قریب تھا۔ اگر یہ رقم نہیں بچائی جا سکتی تو نصف ہی بچا لی جائے اس طرح کہ قیدی کو اس بات پر آمادہ کر لیا جائے کہ وہ پانچسو روپے سال لے لیا کرے اور اس ملک سے چلا جائے۔ جب اس تجویز میں بادشاہ اور اس کے وزرا متفق ہو گئے تو پھر قیدی کونسل کے سامنے طلب کیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ:۔

"تم کو پانچ سو روپے سال پنشن ملے گی۔ بشرطیکہ تم اس ملک سے چلے جاؤ۔"

گو قیدی تجویز کو انصاف اور قانون کے خلاف سمجھتا تھا، لیکن لوگوں کے سمجھانے سے وہ بالآخر راضی ہو گیا۔ چنانچہ اب وہ سرحد کے قریب ایک چھوٹے سے باغ میں رہتا ہے۔ ہر تیسرے مہینے بادشاہ کا ہرکارہ اس کی پنشن اس کو دے جاتا ہے۔ اسطرح اس کے حبسِ دوام کی طویل مدت گذر رہی ہے۔

جو تکلیفیں اور پریشانیاں اس قیدی کے متعلق وزرائے سلطنت کو ہوئیں اس کا لحاظ کر کے ملک کے قانون میں اب اس قدر ترمیم کر دی گئی کہ آئندہ مجرموں کو سزا کے بعد جیل خانہ میں رکھنے کے بجائے پنشن دیکر ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ ہمسایہ ممالک میں سرکاری پنشن پر اپنی سزا کا زمانہ بسر کر لیتے ہیں۔

گھوڑا، ٹیگور کا تخیل

برہما دیوتا کو دنیا کے لئے جو کچھ پیدا کرنا تھا، قریب قریب سب ہی پیدا کر چکا، اب وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ شاید اس فکر میں تھا کہ کوئی نئی چیز، کوئی عجیب تر مخلوق اپنے کائنات آفریں دماغ سے نکال کر عالم امکان میں لائے ـــــ دفعتاً اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اسے کوئی نئی بات سوجھی ـــــ اس کی قوتِ تخلیق نے کوئی نیا تخیل پیدا کیا۔

دیوتا نے اپنے کارخانہ قدرت کے مہتمم کو طلب کیا۔ "پانچ عناصر لاؤ، بہت سے، ہم ایک نئی چیز پیدا کرنے والے ہیں۔"

مہتمم نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "اے خالق، اے کرتار! جب تو نے تخلیق کے جذبۂ بے اختیار کے ساتھ اپنے کارخانہ کا سارا سامان بے دریغ خرچ کر ڈالا، اور ہاتھی، اونٹ، شیر، ریچھ جیسے کثیر الجثہ اور قوی الجسم جانور پیدا کر ڈالے تو اے داتا تو نے اپنے ذخائر پر ذرا بھی نظر نہ کی۔ اب تو مخلوق کے جسم میں طاقت اور جسامت پیدا کرنے والے تمام عناصر ختم ہو چکے، خاک، پانی، اور آگ بہت قلیل مقدار میں باقی ہیں ہاں ہوا اور اکاس جتنا چاہیئے موجود ہے۔"

چار سر والا دیوتا سوچنے لگا۔ اپنی چاروں مونچھوں پر وہ بار بار ہاتھ پھیرتا تھا آخر اس نے کہا، جا جو کچھ باقی ہے وہی لے آ۔ پھر جدت طراز تخیل ذخائر کی کمی کو پورا

کرے گا۔"

عناصر کی قلت نے برہما کو کفایت شعاری پر آمادہ کیا۔ اس نے خاک، پانی اور آگ کو بہت کم مقدار میں صرف کیا۔ اور اکاس زیادہ صرف کی۔ ایک نئے جانور کا پتلا تیار ہو گیا، ذخائر کی کمی کے باعث اس کو نوکدار نیچے اور سینگ نہیں دیئے گئے دانت ایسے دیئے گئے کہ سوائے چبانے کے کوئی دوسرا کام نہ کر سکیں۔ پھر اس کے خمیر میں آگ نہ اتنی زیادہ ڈالی گئی کہ وہ جنگجو ہو جائے۔ نہ اتنی کم کہ بزدل ہو جائے ــــ اس طرح برہما نے اپنے تخیل کو جامۂ ہستی پہنایا ــــ یہ جانور گھوڑا بنا۔

جب اس کو زمین پر کھڑا کیا گیا تو وہ ایک لمحہ بھی بے حرکت نہ رہ سکتا تھا اکاس اور اتھر اس کو بے چین رکھتا تھا، وہ ہوا سے آگے جانا چاہتا تھا، زمین کی ساری وسعت کو اپنے ایک قدم کے برابر نہ سمجھتا تھا۔ دوسرے جانور کوئی ضرورت یا سبب ہو تو دوڑتے ہیں، مگر یہ بے ضرورت دوڑنے لگا۔ گویا اپنی کھال سے باہر نکل جائے گا۔ وہ نہ کسی کو مارنا پکڑنا چاہتا ہے۔ صرف چاہتا ہے کہ بھاگتا چلا جائے"تا آنکہ حد نظر پر اس کا وجود ایک نقطۂ موہوم ہو جائے۔ اس کا عکس وہم و خیال ہو کر رہ جائے اور وہ خلائے بسیط میں گم ہو جائے۔!!

... ...

چار سروالا برہما اپنی اس نئی مخلوق کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تمام مخلوق کو مسکن دیئے۔ کسی کو جنگل کسی کو دریا۔ کسی کو پہاڑوں کے غار، لیکن گھوڑے سے وہ اس قدر خوش تھا کہ اس نے اپنی جدید مخلوق کو اپنی نظروں کے سامنے

ایک سبزہ زار عطا کیا کہ وہ وہاں اپنی تیز رفتاری کے مزے لوٹا کرے۔ مگر ....
اس سبزہ زار کے پاس ہی انسان کا مسکن تھا۔

انسان کی فطرت کے لئے وجہ طمانیت، لوٹ مار، قتل و غارت ہے۔
بلکہ اس قدر لوٹتا ہے کہ اس کا مال و اسباب کا بوجھ اس کی گردن پر ناقابل برداشت ہو جاتا ہے، اس کی دولت اس کی کمر کو زخمی کر دیتی ہے۔ پس جب اس نے گھوڑے کو دیکھا، وہ ہوا کا تعاقب کرتا ہے اور آسمان کو ٹھکراتا ہے، تب اس نے اپنے جی میں کہا۔

"اگر یہ گھوڑا میرے قبضہ میں آجائے تو میں اس کی کمر پر اپنا بوجھ رکھا کروں ہا! میں کیسا ہلکا ہو جاؤں گا! ——— اس نے ایک دن گھوڑے کو پکڑ لیا۔

پھر اس نے گھوڑے کی پشت پر زین کس دی اور اس کے منہ میں ایک خاردار زنجیر لگا دی۔ اس نے تازیانہ اور مہمیز بنائے تاکہ وہ گھوڑے کو سمجھا سکے کہ اپنی مرضی کے مطابق اور اس کی مرضی کے خلاف چلنا کتنا بڑا گناہ ہے۔!

گھوڑے کے گرد اونچی دیواریں بنا دی گئیں، تاکہ وہ بھاگ نہ جائے۔ اس کے پاؤں میں رسیاں باندھ دی گئیں۔

شیر کا مسکن جنگل تھا، وہ بدستور اپنے جنگل میں رہا، چیتے کا مسکن پہاڑوں کے غار تھے، وہ بدستور غاروں میں رہا، مچھلیوں کا وطن دریا تھا، وہ دریا میں رہا۔ لیکن گھوڑے کا گھر کھلا ہوا سبزہ زار تھا۔ اس لئے وہ اصطبل میں بند کر دیا گیا۔ اس کے خمیر میں اکاس اور ہوا جزو غالب تھی۔ اس کے دل میں آزادی کی تمنا ئیں بے تابانہ

پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن بالکل اسی لئے کہ وہ آزادی کی تمنا رکھتا تھا۔ اس کے پاؤں میں رسّی باندھ دی گئی۔

گھوڑے نے جب دیکھا کہ اس کی گردن میں غلامی کا طوق بہت بھاری ہے تو اس نے اصطبل کی دیواروں پر لتّیں مارنی شروع کی۔ لیکن اس عمل سے دیواروں کو تو اس قدر صدمہ نہ پہنچا کہ جتنا خود گھوڑے کی ٹانگوں اور سموں کو۔ تاہم دیواروں کا تھوڑا سا چونہ جھوٹ کر گر گیا اور اس کی ظاہری خوبصورتی ضرور کم ہو گئی۔

مگر انسان کو گھوڑے کی یہ حرکتیں نہایت ناگوار گذریں۔ جھنجھلا کر ایک دن اس نے کہا۔ "احسان فراموش جانور! کیا میں اس کو دانہ پانی نہیں دیتا؟ کیا میں اس کا جسم ملنے کے بڑی بڑی تنخواہوں کے ملازم نہیں رکھتا۔ اور اس ناشکرگذار کو دیکھو یہ کسی طرح خوش نہیں"

ملازموں نے گھوڑے کے خوش کرنے کی ایسی ایسی تدبیریں کیں کہ وہ آخر نہ صرف لتّیں مارنا بھول گیا بلکہ اس کی بہت سی فطری طاقتیں بھی سلب ہو گئیں۔

ایک دن انسان اپنے بہت سے دوستوں اور پڑوسیوں کو جمع کر کے گھوڑے کے پاس لایا، "دوستو! جیسا میرا گھوڑا وفادار ہے ایسا وفادار جانور تم نے کبھی دیکھا ہے؟"

دوستوں نے کہا: "کبھی نہیں، کبھی نہیں، یہ تو ایسا بے حس و حرکت ہے جیسے خالق کا پانی اور ایسا نرم مزاج ہے جیسا تمہارا مذہب۔"

یہ تو معلوم ہی ہے کہ جب گھوڑا پیدا کیا گیا تو نہ اس کے سینگ تھے نہ تیز دانت نہ نوکدار پنجے۔ پھر جب اس کا دیوار پر لتّیں مارنا بھی روک دیا گیا تو اب

سوائے آواز کے اس کے پاس اپنے محسوسات کے اظہار کا ذریعہ ہی کیا باقی تھا؟
—— لیکن اس کی آواز سے انسان کی نیند خراب ہوتی تھی! پھر یہ بھی خیال تھا اس کی آواز سُن کر ہمسائے کیا کہیں گے جن کو اس کی وفاداری کا پورا یقین دلایا جاچکا ہے۔ پس انسان نے ایسی تدبیریں کیں کہ گھوڑے کا منہ بھی بند ہوگیا۔ مگر جب تک جسم میں جان باقی ہے کچھ آواز تو ضرور نکلے گی (جو لوگ آواز بند کرنا چاہیں ان کو چاہیئے کہ سانس بھی بند کردیں۔ چنانچہ گھوڑے کا منہ تو بند تھا مگر کراہنے کی آواز کبھی نہ کبھی نکل ہی جاتی تھی۔

ایک دن یہ آواز برہما کے کانوں تک پہنچی۔ دیوتا اپنے مراقبہ سے چونکا۔ زمین کی طرف نظر کی تو گھوڑے کو سبزہ زار پر نہ پایا! جھنجلا کر موت کے دیوتا کی طرف پلٹا "یہ سب تمہاری حرکت ہے۔ تم نے میرے گھوڑے کو دنیا سے اٹھا لیا۔"

موت نے کہا "میرے دیوتا۔ سارے عالم کے خالق! تجھے بدگمانی ہوئی ہے مجھ ہی پر ہوتی ہے! تو اگر ایک نظر انسان کی طرف دیکھے تو تجھے ساری خرابیوں کا حال معلوم ہو جائے!" برہما نے پھر زمین کی طرف دیکھا۔ اس نے اصطبل کی چار دیواری دیکھی اور اس کے اندر سے اپنے گھوڑے کے کراہنے کی آواز سُنی۔ برہما کی پیشانی پر غصہ کی شکن پیدا ہوئی۔ اس نے گرج کر کہا "اے سُن رے انسان! اگر تو میرے گھوڑے کو آزاد نہ کردے گا تو میں اس کے بازوؤں میں شیر کے پنجے اور اس کے منہ میں چیتے کے دانت پیدا کر دوں گا۔" انسان نے برہما کی آواز سُنی اور کہا "اے دیوتا! دنیا میں خونخواری کو ترقی دینا تیری شان سے بعید ہے۔ اگر مجھے صاف گوئی کی اجازت ہو تو عرض کروں کہ تیرا گھوڑا اس قابل ہی نہیں کہ اس کو آزاد رکھا جائے میں نے

تو اسی کے فائدے کے لئے یہ اصطبل بنایا ہے۔ !اے دیوتا ! دیکھ تو میں نے تیرے گھوڑے کے لئے خوبصورت اور آرام دہ اصطبل بنایا ہے۔

برہما خاموش تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔

انسان نے پھر کہا" اے میرے دیوتا ! تیری عقل کے سامنے میرا سر تسلیم خم ہے لیکن ہفتہ بھر کی مہلت عنایت ہو، اگر ہفتہ بھر گذرنے کے بعد بھی تیری رائے یہی ہو کہ اس جانور کے لئے میرے اصطبل کے مقابلہ میں تیرا سبزہ زار بہتر ہے تو میں تیرے حکم کے آگے سر جھکا دوں گا۔

انسان نے مہلت کا یہ زمانہ ضائع نہیں کیا۔ اُس نے گھوڑے کی دو ٹانگوں میں رسی باندھ کر کھیتوں میں چھوڑ دیا۔ گھوڑا بُری طرح لنگڑاتا تھا اور جنگل کے چرند پرند اُس کی تمسخر آمیز چال کو دیکھ کر ہنس رہے تھے، برہما نے اوپر سے گھوڑے کی اس بدنما چال کو دیکھ کر منہ بنایا۔ ——— اُس نے بدنما رفتار کو تو دیکھا مگر ——— اس رسّی کو نہ دیکھا جو اس کی ٹانگ میں بندھی ہوئی تھی۔ ! دیوتا سوچنے لگا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ ایسے گھوڑے کا وجود تو میری صناعی پر حرف لائے گا۔ دوسرے دیوتا میری اس جدت پر ہنسیں گے۔ میں نے یہ کیسی غلطی کی کہ ایسا جانور پیدا کیا ۔ ۔ ۔"

انسان اس وقت کا منتظر تھا۔ سمجھ گیا کہ دیوتا کے دل میں کیا ہے۔ اس نے پکارا۔ " اے میرے دیوتا ! دیکھ لیا تو نے اپنے گھوڑے کو۔ تیرا حکم ہو تو میں اسے تیرے آسمانوں کے کسی سبزہ زار میں پہنچا دوں۔"

برہما نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر کہا" نہیں ! اے انسان ! نہیں ! لے جا تو اس

گھوڑے کو اپنے اصطبل میں لے جا۔"

انسان نے ذرا بلند آواز کر کے کہا: "دو جہان کے دانا! یہ گھوڑا انسانوں کے لئے ایک بارِ گراں ہو جائے گا۔"

برہما نے کہا: "جا! اے انسان! تیرے لئے یہ بھی ایک بارِ امانت ہے، تیری انسانیت کا اقتضا یہ ہونا چاہیئے کہ اس بار کو برداشت کرے جا! گھوڑا اپنے اصطبل میں لے جا اور اس کی حفاظت کر۔"

"تیرا حکم! میرے دانا! یہی ہے تو یہی سہی۔" انسان نے کہا۔

ہر چیز کا نتیجہ بُرا ہے !!

یوں تو ہمارے قصبہ کے اسکول میں بہت سے عجیب و غریب ماسٹر صاحبان تھے
مگر سچ یہ ہے کہ بڑے ماسٹر صاحب عجیب تر تھے۔ قصبہ کا بچّہ بچّہ ان کی خصوصیات سے
واقف تھا۔ عمر پچاس اور پچپن کے درمیان، داڑھی کھچڑی اور اس کے بال اُلجھے ہوئے
اُلجھے ہوئے —— اُلجھے ہوئے اس لیے کہ اس کے سلجھانے کی طرف کبھی "بڑے ماسٹر صاحب"
کافی توجہ کر ہی نہ سکتے تھے۔ وجہ یہ کہ بازار میں کنگھیوں کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ تین چار
حتیٰ کہ پانچ پیسے! —— کوئی کمبخت دوکاندار اس سے کم قیمت پر کنگھی فروخت نہ کرتا
تھا۔ اس عام گرانی کے باعث بڑے ماسٹر صاحب نے بازار جانا ہی ترک کر دیا تھا۔ وہ
ایک سیاہ سوتی اچکن پہنا کرتے تھے اور سیاہ سوتی پگڑی ان کے سر پر ہوتی تھی۔ ہر موسم
میں ان کی وہی اچکن اور پگڑی استعمال ہوتی رہتی تھی۔ اور اگر قصبہ کے تمام باشندوں
سے حلفی بیان لیا جائے تو ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ملیگا جو یہ کہہ سکے کہ اس نے
کبھی ماسٹر صاحب کو اس اچکن اور اس پگڑی کے بغیر دیکھا ہے۔ ایک تیسری چیز جو اُن کے
سیاہ لباس کا —— لباس کا نہیں بلکہ جسم کا جزو لازمی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی چھڑی
تھی جو ایک غلاف میں ملفوف رہا کرتی تھی۔ چوتھی ضروری چیز ان کی عینک تھی۔ وہ بھی ایک
سیاہ خانہ میں بند رہتی تھی۔ اور صرف سبق کے وقت اپنے خانہ سے نکل کر ان کی ناک
کی نوک پہ کچھ رکھی رہتی تھی۔ اور پھر اسکول کا آخری گھنٹہ بجتے ہی اپنے خانہ کے اندر ملفوف
ہوجاتی تھی۔ پانچویں اہم شے جس کا تعلق بڑے ماسٹر صاحب کے وجودِ فانی سے تھا۔ ایک

موٹی اور بھاری گھڑی تھی۔ جو ایک سیاہ چمڑے یا کرمچ کے غلاف میں محفوظ رہتی تھی اور ماسٹر صاحب صرف دو ہی دفعہ اس کو اپنی جیب اور پھر اس کو غلاف سے نکالا کرتے تھے سبق شروع کرنے وقت اور سبق ختم کرنے وقت۔"

ماسٹر صاحب کا بشرہ بھی کچھ ایسا تھا کہ گویا اس پر ایک سیاہ غلاف چڑھا ہوا ہے۔ غصہ رنج، خوشی اس قسم کی کیفیات عمر بھر ان کے چہرہ ناآشنا رہیں۔ ہنستے ہوئے ان کو کبھی کسی شخص نے نہیں دیکھا۔ نہ روتے ہوئے، نہ غصہ کی حالت میں۔ درحقیقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید ان کی روح پر بھی کوئی سیاہ غلاف چڑھا ہوا ہوگا۔

آواز ان کی بہت دھیمی اور گفتگو کا لہجہ نہایت نرم تھا، مگر بات وہ صرف اتنی ہی کرتے تھے جتنی کہ بالکل ناگزیر ہو۔ بہت سے مطالب وہ محض اشاروں ہی سے ادا کر دیتے تھے۔ مثلاً اگر کلاس میں سبق پڑھاتے پڑھاتے ان کو پیاس لگی۔ تو وہ کبھی یہ نہ کہتے تھے کہ "پانی لاؤ، مجھے پیاس لگی ہے" بلکہ اپنے مخصوص اشاروں اور مخففات سے کام لیتے تھے۔ یعنی آہستہ سے "لاؤ" کہا۔ اور ہاتھ کی انگلیوں سے پیالے کی شکل بنا کر دکھا دی استاد کے ان رموز سے شاگرد اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ اس لئے کبھی مفہوم کے اظہار میں کوئی خرابی واقع نہ ہوتی تھی۔ ماسٹر صاحب کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ اس لئے اشارات کا سلسلہ بھی کچھ زیادہ وسیع نہ تھا۔ ہو سکتا تھا۔ پان، سگریٹ، حقہ شربت سوڈا لیمنیڈ اس قسم کی تمام فضولیات سے وہ سخت پرہیز کیا کرتے تھے۔ ان کی غذا بہت سادہ اور مختصر ہوا کرتی تھی۔ صبح کو چار پیسے کا آٹا لاتے تھے۔ اس کی دو موٹی موٹی روٹیاں خود ہی پکا لیتے تھے اور آٹھ آنے کی شکر میں سے جو وہ ہر مہینے کے شروع لایا کرتے تھے ایک دو چٹکی پانی کے ایک آبخورہ میں ڈال کر شربت بنا لیتے تھے۔ اس شربت میں ایک

روٹی صبح اور ایک شام گھر میں کھا لیتے تھے

اِس کے علاوہ کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انہوں نے مدرسہ آتے یا جاتے کسی خانچہ والے سے دو تین سفریاں۔ یا شریفے، یا کھٹے میٹھے آم بھی خریدے لیکن ان پھلوں کو کھاتے کسی نے نہیں دیکھا۔ بہرحال اس قدر فرض کر لینا جائز ہے کہ جب وہ اس قسم کی اشیاء خریدتے تھے تو کھاتے بھی ضرور ہوں گے۔ بہرحال یہ غذا تھی ہمارے بڑے ماسٹر صاحب کی۔"

لیکن سب سے بڑی فضول خرچی جو ماسٹر صاحب برداشت کرتے تھے مکان کے کرایہ سے متعلق تھی۔ یعنی وہ تقریباً عہ/ اپنے مکان کا کرایہ دیتے تھے۔ ایک کھپریل اس کے سامنے ۴ گز مربع صحن معہ ایک بیر کے درخت کے۔ یہ مکانیت تھی۔ یہ بلا کسی سیاسی یا مذہبی یا معاشرتی تعصب کے، آپ غور کریں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ مہاتما گاندھی بھی اس سے کم ذاتی خرچ پر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ ہم لوگوں نے یعنی شاگردوں نے ماسٹر صاحب کے ذاتی آمد و خرچ کا ماہوار تقریباً صحیح تخمینہ لگا لیا تھا۔

خرچ		آمد	
آٹا	۸عہ/	تنخواہ ماہوار	ماعہ/
شکر	۸/	بذریعہ پرائیویٹ تعلیم	للعہ/
کرایہ مکان	۱۴عہ/	میزان	ماللعہ/
متفرقات جس میں پارچہ پوشیدنی کے بدیہا شامل ہے	۸عہ/		
میزان	۱۰عہ/		

پس انداز کا اندازہ؟ —— آمد و خرچ کی ان تفصیلات کے بعد ضروری نہیں۔

اتنا اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اخراجات میں متفرقات کی مد بڑھتی بہت کم تھی اور گھٹتی اکثر رہتی۔ اسی طرح آمدنی میں طلبہ کو پرائیویٹ طور پر سبق پڑھانے کی مد گھٹتی کم تھی اور بڑھتی اکثر رہتی تھی۔

بہر حال ہمارے ماسٹر صاحب آپ بھی مان لیں گے کہ تھے عجیب ہی وضع قطع کے آدمی۔ ان کی تمام تر ہیئت معنوی گویا ایک غلاف میں بند تھی۔ اور کوئی شخص ان کی طبیعت اور اس کی کیفیات سے واقف نہ تھا۔ جس طرح ان کی گھڑی یا چھتری یا عینک ملفوف رہتی تھی، اسی طرح وہ گونا ہمہ تن ملفوف تھے۔ صبح ٹھیک ۹½ بجے لوگ ان کو معہ اپنی لمبی اور سیاہ اچکن اور متوسط النقامت عمامہ کے اپنے گھر سے مدرسہ کی طرف جاتے دیکھتے اور چار بجے آتے۔ قصبہ کے تمام باقی راستے علاوہ اس سڑک کے جو ان کے مکان اور مدرسہ کے درمیان تھی۔ ان کے قدموں سے ناآشنا تھے۔ اعزا۔ دوست احباب۔ یار۔ آشنا ان سب جھگڑوں سے ان کی زندگی پاک تھی ... ... کبھی ان کو کسی نے سواری پر سوار نہیں دیکھا۔ ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ ہر حال اور موسم میں سنبھال لیتی تھیں۔

کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان کا وطن کہاں ہے۔ اور وہ اس مدرسے میں آئے کہاں سے۔ بیس برس ان کو قصبہ میں رہتے گذر گئے تھے۔ اور کیا تعجب کہ جس وقت نئے مدرسہ کی بنیاد کھودی جا رہی تھی تو وہ اسی بنیاد میں سے معہ اپنی سیاہ اچکن اور عمامہ کے برآمد ہوئے ہوں۔ اور بجنسہ کرسی بچھا کر پڑھانے بیٹھ گئے ہوں ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ علاوہ اچکن اور عمامہ کے ماسٹر صاحب کے پاس ایک بڑا سوتی رومال بھی تھا۔ کوئی گز بھر مربع۔ جس کے ہر کونے میں کئی گرہیں لگی ہوئی تھیں

معلوم نہیں ان گرہوں میں کچھ تھا یا خالی تھیں۔ بہر حال ان کو کبھی کھلتے کسی نے نہیں دیکھا۔

ماسٹر صاحب کی رائے میں کوئی امر حرکت یا واقعہ خطرے سے خالی نہ تھا ہر چیز کے نتائج سے وہ خائف رہتے تھے۔ اور ان کی طبیعت کا صرف یہی ایک رخ کسی قدر بے نقاب تھا۔ ہر معاملہ میں ان پر نفی کا پہلو اثبات سے زیادہ مُؤثر تھا۔ ہر چیز کی علت سے زیادہ اُس کی حرمت پر اُن کی نظر رہتی تھی۔ ہر سفید چیز میں بھی وہ سیاہی کی ایک جھلک دیکھ لیا کرتے تھے۔ مثلاً مغرب کے بعد اگر انہوں نے اپنے کسی شاگرد کو بازار کی طرف جاتے دیکھا تو وہ چلتے چلتے رک جائیں گے یا اگر اپنے دروازہ پر کھڑے ہیں تو گھبرا کر کیواڑ کی کنڈی پکڑ لیں گے اور اپنی دھیمی آواز میں مگر اضطراری طور پر بار بار فرمائینگے۔ "نتیجہ بُرا ہے، بہت بُرا ہے۔" الفاظ کی فضول خرچی صرف اسی فقرے تک محدود تھی جو ہر موقعہ پر ان کی زبان سے نکلا کرتا تھا "نتیجہ بُرا ہے" اپنے کلاس میں اگر وہ کسی لڑکے کو شرارت کرتے دیکھ لیتے تو بیٹھے سے اٹھ کھڑے ہوا کرتے تھے۔ کلمہ کی انگلی چھت کی طرف اٹھائی جاتی تھی۔ اور مجرم کی طرف مخاطب ہو کر فوراً فرماتے تھے "نتیجہ بُرا ہے۔ اگر کہیں سڑک پر دو آدمی جھگڑا کرتے ہوئے مل جاتے تو وہ چلتے چلتے رک کر ایک لمبا سانس لیتے اور فرماتے: "نتیجہ بُرا ہے" اگر قصبہ میں کہیں گانے بجانے کی آواز آجاتی یا کسی کے گھر باجا بجتے سن لیتے تو "نتیجہ بُرا ہے" کہے بغیر کبھی نہ رہتے۔

یہ ضرور نہیں کہ ان کی اس تنبیہہ کو کوئی سنے بھی۔ اکثر تو وہ اس قدر آہستہ یہ جملہ ادا کرتے تھے کہ شاید ان کی آواز ان کی ناک کے طول سے بھی آگے نہ جا

سکتی تھی ۔!"

بہر حال نتیجہ کا خوف ان کو ہر وقت ستاتا رہتا تھا۔ اگر ان کے مدرسہ کے کوئی اُستاد پڑھاتے پڑھاتے منہ کھول کر سو جاتے (جیسا کہ اکثر ہوتا تھا) اور وہ یہ منظر دیکھ لیتے تو ماسٹر صاحب استادِ خوابیدہ کو جگائے بغیر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں یہ کہتے ہوئے گذر جاتے تھے کہ نتیجہ بُرا ہے!" وہ ہر معاملہ میں اس درجہ محتاط تھے کہ اکثر بہت زیادہ غور و خوض کے بعد بھی وہ سوائے اس نتیجہ کے اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچ پاتے تھے کہ "نتیجہ بُرا ہے!" فرض کیجئے کہ ان کے سامنے ایک لڑکا پیش کیا گیا جس نے اپنے استاد کے ساتھ گستاخی کی ہے۔ اب وہ تحقیقات شروع کریں گے۔

مدعی کہے گا:۔

"اس لڑکے نے میرے ساتھ گستاخی کی جناب ۔!"

لڑکا کہے گا:۔

"میں نے کوئی گستاخی نہیں کی ماسٹر صاحب! میں تو صرف ہنسا تھا۔ مولوی صاحب یہ سمجھے کہ میں ان کا منہ چڑا رہا ہوں ۔"

"ہوں!" ماسٹر صاحب فرمائینگے۔

لڑکا اپنی داستانِ غم بیان کریگا۔

"مجھے مولوی صاحب نے بہت مارا، جناب! میں پٹتا رہا اور کچھ نہیں بولا۔

"ہوں ۔" ماسٹر صاحب فرمائیں گے۔

مدعی استاد صاحب فرمائیں گے:۔

"نہیں جناب! یہ جھوٹا ہے۔ یہ بہت دفعہ اسی قسم کی شرارتیں کر چکا ہے۔ سزا

ملنی چاہیئے اس کو۔"

"ہوں!" ماسٹر صاحب فرمائیں گے۔

مدعی صاحب زور دیں گے۔

"میری رائے میں تو جناب اس کو مدرسہ سے خارج کیا جائے۔"

"ہوں!" اور ماسٹر صاحب دفعتاً کھڑے ہوں گے۔ ان کی کلمے کی انگلی ملزم کی ناک کے قریب چھت کی طرف سیدھی اٹھ جائے گی ——— نتیجہ بہت برا ہے جاؤ۔"

یعنی فیصلہ ہوگیا۔ تحقیقات ختم۔ کیا فیصلہ ہوا؟ کسی کو معلوم نہیں۔ لڑکا اور اس کے استاد۔ مدعی اور ملزم دونوں بدستور اپنے کلاس میں موجود۔

کسی نے ایک دفعہ ماسٹر صاحب کو سمجھایا کہ آپ ٹال جاتے ہیں اور شریر لڑکوں کو سزا نہیں دیتے۔ اس لئے مدرسہ کا نظم خراب ہوتا جاتا ہے۔ جب وہ بولنے پر مجبور کر دیے گئے تو انہوں نے فرمایا :-

"میں سزا دیتا اور جو در اصل ہوتا وہ بے قصور۔"

ان سے کہا گیا کہ جب قصور ثابت ہو جائے تو پھر بے قصوری کا کیا سوال؟ فرمایا :-

"امکان تو ہر حال میں ہے نا۔ عجلت کا نتیجہ برا ہے۔"

اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں بھی وہ اکثر جایا کرتے تھے لیکن ہوتا یہ تھا کہ دفعتاً، دبے پاؤں جیسے اڑتی ہوئی کوئی روح۔ بے آواز، کسی کمرے میں پہنچ گئے۔ لڑکوں نے ادب سے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ وہ چارپائی یا کرسی پر بیٹھ گئے۔

گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھے رہے۔ بالکل خاموش۔ اس کے بعد دفعتاً اٹھے اور چلے گئے۔
اس خاموش ملاقات میں اگر کسی لڑکے نے سوالات کرتے کرتے ان کو بولنے پر مجبور ہی کیا تو انہوں نے اس قدر مختصر جواب دیئے کہ آخر گفتگو کے سلسلے کو شروع ہوتے ہی زنجک چاٹ گئی۔

" ماسٹر صاحب عید کی تعطیل ایک دن کی ہے یا دو دن کی۔؟"

ماسٹر صاحب نے دو انگلیاں اٹھا دیں۔

" ماسٹر صاحب! امتحان کس تاریخ سے شروع ہوگا۔؟"

ماسٹر صاحب نے پانچ انگلیاں اٹھا کر کہا " اگست۔"

غرضیکہ باوجود شاگردوں کی متعدد کوششوں کے ماسٹر صاحب اپنی محففات کی دنیا سے بہت کم باہر آتے تھے، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ یوں تو عموماً ماسٹر صاحب ہر قسم کی سواری کے بہت خلاف تھے۔ مگر بائیسکل سے تو گویا ان کو بیر تھا۔ اسکول کا جو ماسٹر یا لڑکا بائیسکل استعمال کرتا تھا وہ اس سے ہمیشہ ناخوش رہتے تھے۔ سڑک پر مدرسہ کے کسی طالب علم کو بائیسکل پر سوار جاتے دیکھتے تو عادت کے خلاف اس کو آواز دے کر روکنے کی کوشش فرماتے۔

" چھی چھی، صحت خراب۔ (سینے کی طرف اشارہ کرکے) کمزور (کمر پر ہاتھ رکھ کر) ٹیڑھی، فضول، واہیات، نتیجہ بُرا ہے۔ چھی چھی"

اس قدر لمبی چوڑی تقریر صرف بائیسکل ہی کے متعلق کیا کرتے تھے۔ ورنہ عموماً اظہار ناخوشی کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے بڑے رومال کے کونے کو وہ اپنی ناک پر رکھ کر ایک آواز نکالا کرتے تھے۔ جیسے بند نکام یا نزلہ ہو۔

ماسٹر صاحب کو فارسی زبان سے خاص شوق تھا، حالانکہ خود وہ ہندو تھے۔ اور سنسکرت کے فاضل کہے جاتے تھے۔ اکثر یعنی دو چار مہینے میں ایک دفعہ ایک خاص کیفیت ان پر طاری ہوتی تھی۔ اس وقت وہ فارسی زبان میں اپنے محفوظات ادا کرنے لگتے تھے۔

"فارسی۔ خوب ـــــ شیریں فصیح (کانوں کی طرف اشارہ کر کے) خوش آئید دانی؟ چہ دانی؟ نمی دانی؟ ہلے۔ بال (اپنی طرف اشارہ کر کے) دانم، خوب (طالب علم کی طرف اشارہ کر کے) ہیچ ـــــ (منہ بگاڑ لیا ـــ گویا نمی دانی کا جملہ پورا کر دیا۔)

اختصار کا لحاظ ہر حال میں رکھتے۔ مثلاً اگر یہ کہنا ہے کہ کل تعطیل ہوگی تو صرف دو لفظ کہہ دیتے "فردا تعطیل"۔ روپیہ پیسہ کی طرح لفظوں کا اسراف بھی ان کو بہت گراں گذرتا تھا۔ ہر لفظ جو ان کی زبان سے ادا ہوتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ گویا ان کی گرہ سے گیا۔ ان کے نزدیک بات کرنے میں خسارہ ہی خسارہ تھا۔ منافع کچھ بھی نہیں۔ اشد ضرورت سے زیادہ الفاظ خرچ کرتے ہوئے ان کا دل دکھتا تھا۔ غرضیکہ یہ تھے ہمارے ماسٹر صاحب۔"

ماسٹر صاحب کی داڑھی میں سفید بال کافی پیدا ہو چکے تھے۔ ان جیسے محتاط اور سنجیدہ آدمی کے متعلق کسی کو کبھی یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ لیکن اللہ کا کرنا یہ کہ وہ گرفتار ہو ہی گئے۔ اس گرفتاری کی تفصیل ہماری داستان کا خاتمہ ہے۔

برسات کا زمانہ تھا اور ماسٹر صاحب کا مکان تھا بوسیدہ۔ مالک مکان تھا بدمعاملہ

کمبخت باوجود ۱۲ ماہوار کرایہ لینے کے مکان کی مرمت سے ہمیشہ غافل رہتا تھا۔ ایک دن ماسٹر صاحب سو رہے تھے۔ ایک طرف کی دیوار آ رہی اور اس کا کچھ حصہ ماسٹر صاحب کے اوپر گرا۔ نتیجہ بُرا ہونا ہی تھا، ماسٹر صاحب کا ایک ہاتھ مضروب ہوا اور اس مضروبی کا نتیجہ بھی بُرا ہوا۔ یعنی ماسٹر صاحب روٹی پکانے سے معذور ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ایک شاگرد نے ماسٹر صاحب کو مزید اخراجات سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے گھر کی ماما بھیج دی۔ یہ نیک بخت دونوں وقت آکر ماسٹر صاحب کی ایک روٹی پکا جایا کرتی تھی یہاں تک تو نتیجہ بُرا ہی تھا "بہت بُرا" نہ تھا۔ لیکن عمر میں پہلی دفعہ صنفِ نازک کا اس صورت میں ماسٹر صاحب کے غریب خانہ میں داخل ہونا غضب ہو گیا۔ ماما کم بخت بیوہ تھی۔ عمر ۳۰ سال۔ صورت شکل کی کافی مناسب۔ دوچار دن کے بعد لوگوں نے ماسٹر صاحب کے عادات اور افعال میں کچھ نئی چیزیں دیکھنی شروع کیں۔ دنیا حیران رہ گئی۔

وہ آنکھوں میں سُرمہ لگانے لگے۔

اُن کو بازار میں کنگھی اور ایک آنہ کا چنبیلی کا تیل خریدتے ہوئے دیکھا گیا۔ ان کی داڑھی کے بال منت پذیر شانہ معلوم ہونے لگے۔

ایک دفعہ ماسٹر صاحب اسکول سے گھر آتے وقت مُسکراتے ہوئے دیکھے گئے۔

سارا قصبہ حیران اور پریشان ہو گیا۔ نظریں ہر وقت ان کی طرف اٹھنے لگیں مدرسہ کے لڑکوں نے تو باقاعدہ ایک صیغۂ سراغرسانی قائم کر لیا۔ روزانہ مدرسہ کے اوقات کے بعد اس صیغہ کی رپورٹوں پر گفتگو ہونے لگی۔

"کل شام تو ماسٹر صاحب بازار گئے تھے سُنا! للو حلوائی کی دوکان سے چار آنہ کی مٹھائی اور نو آنے کا حلوہ خریدا تھا۔

"آج بلاقی بزاز کی دوکان سے ماسٹر صاحب نے چار روپے کی ٹُسر خریدی ہے"۔

"صبح ماسٹر صاحب نے نائی کو بجائے دو پیسہ کے ایک آنہ دیا۔ داڑھی بھی کچھ چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔"

اسی قسم کے افکار و حوادث میں ماسٹر صاحب کے شاگرد مبتلا رہنے لگے۔

ایک دن تو قصبہ میں قیامت ہی برپا ہوگئی — ماسٹر صاحب اپنے ایک شاگرد کی مدد سے بائیسکل پر سوار ہونا سیکھتے دیکھے گئے۔ مدرسہ کے تمام استاد پڑھانا اور شاگرد پڑھنا بھول گئے۔ قصبہ کے لونڈے اکثر ماسٹر صاحب ہی کے ارد گرد رہنے لگے سب کو انتظار تھا کہ اب خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔

تفصیلات پردہ اخفا میں ہیں۔ مگر کچھ ہوا ضرور! ایک دن دوپہر کو ماما جب روٹی پکانے آئی تو پھر واپس نہیں گئی اور ماسٹر صاحب بھی دو ہی بجے مدرسہ بند کر کے آئے تو پھر دوسرے دن صبح تک باہر نہ نکلے۔ اس دن مدرسہ تو کھلا رہا۔ مگر عام تعطیل تھی۔ تمام استاد ایک کمرہ میں بیٹھے ہنس ہنس کر کھسر پُسر کر رہے تھے۔ لڑکوں کی ٹولیاں باہر میدان میں جگہ جگہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ اس دن بڑے ماسٹر صاحب ایک خاکی اچکن پہنے ہوئے تشریف لائے۔ قصبہ کے معمر لوگ قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ کم و بیش بیس برس کے بعد ماسٹر صاحب نے دوسری اچکن بدلی ہے گویا زمانہ بدل گیا۔

ایک ہی مہینے میں ماسٹر صاحب کچھ سے کچھ ہو گئے۔ تعطیل کے دن وہ اکثر بازار جانے لگے۔ اکثر دکانوں پر خرید و فروخت کرتے دیکھا جانے لگا۔ کسی دوکان پر سرمہ خرید رہے ہیں۔ کہیں مٹھائی کا ڈونا رومال میں باندھ رہے ہیں۔ کہیں زنانہ پاجاموں کا کپڑا خرید اجارہا ہے۔ کسی جان پہچان کو دیکھا ہنس دیئے "آداب عرض" اور "مزاج شریف" تک نوبت پہنچنے لگی۔ "نتیجہ برا ہے" تو بھول ہی گئے۔ گویا سلیٹ کا لکھا مٹا دیا۔ کوشش کرتے تھے کہ یہ تکیہ کلام زبان پر نہ آنے پائے۔ پھر بھی کبھی کبھی ایک دو لفظ زبان سے نکل ہی جاتے تھے۔

"دیکھو جی، تم سبق یاد کر کے نہیں آتے ــــ نتیجہ ... ..."

"تم بہت شریر ہو گئے ہو جی ــــ نتیہ ــــ"

"غیر حاضر بہت رہنے لگے ہو تم۔ نتا ... ..."

اب نتیجہ برا ہے کی یہ صورت رہ گئی تھی۔

گفتگو میں کچھ تحکم کی شان پیدا ہوتی جاتی تھی۔ لہجہ میں وہ نرمی اور گھبراہٹ اور خوف باقی نہ تھا۔ پرانی وضع احتیاط بھی کم ہو چلی تھی۔ اب وہ کھل کر باتیں کرنے لگے تھے اور ایسے ایسے موضوع پر اُن کی زبان کھلتی تھی جس کا کبھی سننا بھی گوارا نہ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ مدرسہ کے جن ماسٹروں کی شادی نہ ہوئی تھی۔ ان سے مسکرا مسکرا کر فرمانے لگے تھے،

"عزیزم، ہر کہ زن ندارد آسائشِ تن ندارد۔"

زن اور آسائشِ تن کا فلسفہ اب ماسٹر صاحب کی سمجھ میں آنے لگا تھا! کوئی شریر نوجوان ماسٹر جو اب بھی چبھتا ہوا دے دیتا تھا۔

"اجی کیا کہئے!" بڑے ماسٹر صاحب چمک کر فرماتے "نتیجہ وتیجہ کیا ذرا کر تو لو شادی۔"

غرض یہ کہ بڑے ماسٹر صاحب کا تجرد رخصت ہوا تو اپنے ساتھ ان کی قدیم اداؤں کا پشتارہ بھی باندھ کر لیتا گیا۔

ماسٹر صاحب کی شادی کو کچھ کم تین مہینے گذر گئے۔ ایک دن خلاف معمول ماسٹر صاحب مدرسہ نہیں آئے۔ شام کو مدرسہ کے دو تین استاد اور چند طالب علم ماسٹر صاحب کے مکان پر گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر چارپائی ماسٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی اہلیہ موجود نہ تھیں۔ ماسٹر صاحب کچھ پریشان حال معلوم ہوئے مزاج پرسی کے جواب میں انہوں نے پھر اپنے قدیم اختصار سے کام لیا۔

"بیمار۔" (سر پہ انگلی رکھ کر) "درد۔"

یہ آخری دیدار تھا جو لوگوں کو عرصے تک یاد رہے گا۔ اس کے بعد ماسٹر صاحب لاپتہ ہو گئے۔ نہ معلوم کہاں گئے؟ دو تین دن بعد ان کا مکان خالی پڑا تھا۔ ان کے پلنگ پر ان کا بستر بدستور موجود تھا۔ ایک طرف ایک پرانا لوٹا رکھا تھا۔ ماسٹر صاحب کا صندوق کھلا پڑا تھا۔ اس میں دو جوڑے کپڑے بھی کھلے پڑے تھے۔ پانی پینے کا گلاس طاق میں رکھا تھا۔

کچھ عرصے تک وہ مکان ان شاگردوں اور ہموطنوں کی زیارت گاہ بنا رہا۔ اور ماسٹر صاحب کے انجام سے متعلق جتنی زبانیں تھیں اتنی ہی باتیں مشہور ہو گئیں۔ کوئی کہتا تھا ماسٹر صاحب کی اہلیہ ان کی تمام پونجی لیکر فرار ہو گئیں اور اس صدمہ کی حالت میں

ماسٹر صاحب نے خودکشی کر لی۔ کوئی کہتا تھا کہ ماسٹر صاحب اپنی بیوی کی فراری سے شرما کر روپوش ہو گئے۔ کوئی کہتا ماسٹر صاحب زندہ ہیں۔ انہوں نے بمبئی میں دوکان کر لی ہے۔ غرض ہر شخص اپنی عقل لڑاتا تھا مگر پتہ کسی کو نہ تھا کہ وہ گئے کہاں مر گئے یا زندہ ہیں۔ ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ اس نے اپنی شادی کے دن ماسٹر صاحب کو خواب میں دیکھا، وہی اچکن، وہی عمامہ وہی چھتری۔ کلمہ کی انگلی اٹھی ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ ہونٹ چل رہے تھے۔ کان لگا کر شاگرد کہتا ہے کہ میں نے سنا۔ فرما رہے تھے "نتیجہ بُرا ہے"

فریب

زمانہ جنگ :- جنگ یورپ۔

مقام :- فرانسیسی محاذ جنگ کے عقب میں ایک چھوٹی سی بستی۔ اس بستی میں ایک کرایہ کے مکان کا معمولی کمرہ۔

وقت :- شام۔

کمرہ میں ایک نوجوان فوجی افسر اور ایک حسین لڑکی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے داخل ہوتے ہیں۔ لڑکی آتشدان میں آگ روشن کرتی ہے۔ دو کرسیاں کھینچ کر آتشدان کے آگے لے جاتی ہے۔ —— فوجی افسر کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ پھر دریچہ کا پردہ گرانے لگتی ہے۔ پردہ گراتے گراتے ہاتھ روک لیتی ہے اور باہر کی طرف میدان میں غروب آفتاب کا منظر دیکھنے میں محو ہو جاتی ہے۔

نوجوان افسر آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ایک اندازِ محبت کے ساتھ ہاتھ رکھ دیتا ہے۔

"ہاں! تو تم نے بتایا نہیں، تم آخر رو کیوں رہی تھیں۔"

"رہنے بھی دو! وہ بات ہی کیا تھی؟ جو میں بتاؤں۔ غروب آفتاب کا نظارہ اکثر روح پرور ہوتا ہے اور جو نظارہ روح پرور ہے۔ وہ کبھی کبھی آنسو بھی پیدا کرتا ہے اور نہیں تو یوں سمجھ لو کہ عورت کے آنسو عموماً بے معنی ہوتے ہیں۔"

"یہ کیونکر؟ ایسا تو نہیں ہے، مجھ سے پوچھو تو میری رائے میں عورت کا رونا قانوناً ممنوع ہونا چاہیئے۔ (ایک مضمحل مسکراہٹ کے ساتھ)" تلوار کے دھنی، میدان کے سورما! تمہارے لئے قانون ایک حرفِ بے معنی ہے۔ پھر اس کا ذکر کیا ——— ہنستے رہو! میں بھی ہنسوں، تم بھی ہنسو، تم تو اس لئے کہ دنیا چند روز ہے اور کل پھر تمہیں میدانِ جنگ میں جانا ہے۔ اور میں اس لئے کہ تنہا ہوں بے یار و غمخوار، اور مجبور! ہنسنے کی کوشش نہ کروں تو روتے روتے مرجاؤں۔"

"ہاں! تو رونے ہنسنے کے فلسفہ کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم کہاں میدانِ جنگ کے اس قدر قریب آکر پھنس گئیں اور پھر اس تکلیف دہ اور شرمناک زندگی میں؟"

"جی ہاں! کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے ——— کیا تم زخمی ہوکر محاذِ جنگ سے ہٹائے گئے تھے۔؟"

"آج ہی تو ہسپتال سے چھٹکارا ملا ہے۔"

"توبہ! پناہ! بخدا! کیا قیامت ہے یہ جنگ! ساری دنیا کو دوزخ بنا دیا۔"

"خدا جانے کب ختم ہوگی ——— یہ بتاؤ تم کس قوم کی لڑکی ہو اور کس ملک کی رہنے والی ہو۔"

"میں؟ ——— میں ——؟ (کچھ گھبرا کر) بس تم یہ سمجھ لو کہ میں روسی ہوں۔"

روسی! بھلا تم کہاں سے کہاں پہنچ گئیں؟ مجھے تو آج تک کبھی کسی روسی حسینہ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ خوب ملیں آج! دنیا کس قدر تنگ ہے!

(نوجوان کے گلے میں باہیں ڈال کر) تم مجھے بہت ہی پیارے اور معقول آدمی معلوم ہوتے ہو! بہت سے مرد ملتے ہیں ——— جوانی کے دیوالے ——— بے مروّت، بے پروا، سنگدل ——— تمہارا دل تو مجھے نرم معلوم ہوتا ہے! کیا سچ مچ تم ایسے ہی نیک خصلت ہو؟ کیا سچ مچ؟ یا یہ بھی ایک دھوکا ہے؟ ایسے دھوکے بیسیوں خندق اور ہسپتال سے فرصت پاکر میری گود میں آتے ہیں۔ فریبی، خود غرض ——— سب کے سب!"

(مسکرا کر) فریبی، خود غرض ——— مرد!"

"بھولی بھالی چھوکری! تو نے مرد کی معنوی زندگی کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ خندقوں میں جا کر دیکھ! کس طرح موت کے کھلے ہوئے منہ میں ہنستے کھیلتے جاتے ہیں! اور ہنس ہنس کر لاکھوں کو موت کی گھاٹ اتارتے ہیں! جھوٹ کہتا ہوں میں؟"

(لڑکی نے رخساروں پر آہستہ سے انگلی مارتے ہوئے)

"بیوقوف چھوکری! اتنا نہیں سمجھتی کہ جو کوئی اپنی موت سے کھیلتا ہے، وہ دوسروں کی موت پر کیوں نہ ہنسے؟"

"ہاں ہاں! سچ کہتے ہو ——— موت سے کھیلنے والے، موت پر ہنسنے والے (طنز کے لہجے میں) کس قدر سچ کہتے ہو!!"

"تمہیں یقین نہیں آتا! جس معرکہ میں میں زخمی ہوا، اس معرکہ میں میری پلٹن کے ہر سپاہی نے مجھ سے بڑھ چڑھ کر دادِ شجاعت دی۔ جس طرح وہ دشمن کی طرف بڑھے، جس طرح انہوں نے اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر رکھ لیا ——— واللہ! کیا عجب سماں تھا۔"

" مگر بُرا نہ ماننیو ـــــ دشمن کی فوج کے سپاہی بھی اپنے کو ایسا ہی سمجھتے ہوں گے ـــــ وہ بھی بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھاتے ہوں گے ـــــ اب کوئی کیا جانے کس کی بہادری اور شجاعت حق بجانب ہے۔"

" ہاں! یہ تو ممکن ہے، دشمن بزدل تو نہیں ہے ـــــ البتہ اصلی وجہِ تفوق حق و باطل کا صحیح امتیاز ہے ـ"

" حق و باطل ـ؟ حق و باطل؟ (جوش بھری آواز میں) نسبتی مصطلحات! نعمت کا فریب! زبان کا مکر ـــــ! حق دونوں طرف پکارا جارہا ہے۔ جس کو میں کہوں وہ بھی حق جس کو تم کہو وہ حق! یہ تمام معیاری خود ساختہ ہیں۔۔ ... ... سُنا تم نے ـــــ سب غلط ہیں ـــــ جو جیتے گا، جو زیادہ خون پی سکے گا، وہی حق پر رہے گا۔"

" یہ کیا باؤلی باولی باتیں کر رہی ہے۔ ننھی گلہری! آ! کچھ عشق و الفت کی بات کر! حق و باطل کا فیصلہ مردوں پر چھوڑ دے۔ جن کے بازوؤں میں طاقت ہے۔"

" مغرور مرد! (مسکراکر) تم اپنی فوج میں افسر ہو نا! دماغ یا دل کی وجہ سے نہیں، صرف قوت بازو کی وجہ سے! تمہارا ـــــ تم مردوں کا تفوق کس قدر مادی اور جسمانی ہے ـــــ روحانی نہیں ہے ـــــ نہیں ہے ـــــ سمجھے تم ـــــ؟"

(مسکراکر) حسین عورت کا زنانہ فلسفہ حسین ہوتا ہے مگر کس قدر ہلکا ـــــ بے ثبات ـ"

" خیر جانے دو! یہ بتاؤ کیا تم یہاں بالکل تنہا مقیم ہو۔ کوئی بھی تمہارا ہم وطن

روسی یہاں نہیں۔"

(لڑکی کے چہرے پر زرد اور گھبراہٹ کے آثار نظر آتے ہیں۔ کچھ جھجکتی ہے پھر دفعتاً ہنستی ہے۔)

"میرے ہم قوم، ہم وطن روسی: روسی میرے ہموطن ؟" (یکایک کچھ سنبھلکر) مجھے تنہائی کی فکر نہیں۔ جب تک شدید گولہ باری ہوتی رہتی تو ہسپتال کے مریضوں اور زخمیوں کا دل بہلایا کرتی ہوں اور جب گولہ باری کا زور کچھ کم ہوتا ہے تو خندقوں میں گھس جاتی ہوں، سپاہی میرا گانا سنتے ہیں مجھے گود میں بٹھاتے ہیں۔ اُن کے بارود سے سیاہ ہاتھ میرے بالوں اور رخساروں سے کھیلتے ہیں ——— اگر تم جیسا کوئی افسر مل جاتا ہے تو اس کمرہ میں چند گھنٹے میرے ساتھ گزارتا ہے۔ صبح کو، شام کو، رات کو جب ساری فضا توپوں اور طیارروں سے گونجتی ہوتی ہے۔ میں کسی فوجی سورما کے تھکے ہوئے اعصاب کو تسکین دیتی ہوں ؛ —— نہ کہو گے مجھے ہمدرد بنی نوع انسان۔"

"تب تو تم خاصا کما لیتی ہوگی۔"

"خاصا ——— ؟ بہت خاصا ! —— آج بھی یہ دیکھو بارہ آنے مری جیب میں ہیں۔"

(لڑکی کو پیار سے اپنی گود میں کھینچ کر)

"بس ! یہ ساری پونجی ہے تیری ؟ اپنی زندگی اس قدر سستی بیچ رہی ہے تو ؟ اس قدر سستی۔"

"مگر یہاں تو زندگیاں۔ جانیں۔ روحیں اس سے بھی زیادہ سستی بک رہی ہیں

بازار کا بھاؤ بہت گرا ہوا ہے ـــــ اے میرے تیغ زن! ایک دو سال کی بار وت میں بیسیوں جانیں خریدی جاتی ہیں اور فروخت کی جاتی ہیں ـــ۔"

"بڑی چیز ہے ... ... یہ جنگ! ... ... مگر ... بہت بری چیز ہے، فرض منصبی! سپاہی کسی کا دشمن نہیں مگر کیا کرے؟ فرض منصبی اس کا خدا ہے، قہار اور جبار اور قادر مطلق! اس خدا سے وہ روگرداں ہو نہیں سکتا تمہارے ملک میں ـــ روس میں ـــ تو برا حال ہے سنتے ہیں۔ کبھی تمہیں اپنے عزیزوں کی بھی خبر ملتی ہے۔؟"

"عزیز۔ یعنی ماں باپ بھائی؟ ـــــ کوئی باقی نہیں ـــ سب اتر گئے موت کے گھاٹ ـ میرا رشتہ بس اب میرے ان عاشقوں سے قائم ہے جو سامنے خندقوں میں منقیم ہیں، مگر وہ بھی ہر روز مرتے رہتے ہیں اور میں ہر روز بیوہ ہوتی رہتی ہوں! مگر دولہا بہت ہیں ـ شب بھر کے دولہا ـــــ اور عقد صرف ایک آنکھ کے اشارے سے تکمیل پاتا ہے! اس لئے مجھے ماتم کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

(لڑکی خوب ہنسی اور ہنستے ہنستے نوجوان کی گود میں لوٹ گئی ـــــ پھر وہ یکایک سنجیدہ ہو گئی۔ اٹھ بیٹھی ـ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے)

میں عروس مشترک ہوں۔ میں فوج کی دولہن ہوں۔ کوئی مجھے یاد نہیں رکھتا سب مجھے شب بھر پیار کرتے ہیں ـــــ اور صبح کو بھول جاتے ہیں ـــ

—— خدا جانے کس دن مجھے گرفتار کر کے بند کر دیں گے۔ جب مجھ سے تھک جائیں گے تو کہیں گے، یہ عورت تو جرمن جاسوس ہے۔ —— پھر ایک دن صبح کو کسی دیوار سے میری کمر لگی ہو گی اور دس بارہ رائفل میرے سینے پر آگ اگل رہے ہوں گے۔ ایک لمحہ کا یہ سب تماشا ہوگا —— بس!"

"تو کیا تم جرمن ہو؟ تم تو کہتی ہو تم روسی ہو۔؟"

(لڑکی کی آنکھوں میں عجیب چمک ہے ہاتھوں کی مٹھیاں بندھی ہوئی ہیں۔ وہ سینہ نکالے کھڑی ہے)

"جرمن! ہاں جرمن تو کہہ دیا میں نے!!"

"دیکھو نا چہرہ بدل گیا تمہارا! ابھی تم میرے عاشق تھے اور ابھی اتحادی فوج کے افسر بن گئے!! عاشق سپاہی کی وردی میں غائب ہو گیا۔ کس لو اپنی پیٹی! لے چلو مجھے پکڑ کے۔"

(افسر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی ہے)

"آہستہ آہستہ! خدا کے لئے آہستہ! عورتوں سے مرد نہیں لڑا کرتے۔ مجھے تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔"

"مگر فرض منصبی —— ! مگر فرض منصبی! اس دیوتا کی قربان گاہ پر اس رنگین تماشی کو چڑھا دو۔ اپنے حب وطن کو اس عورت کے خون سے تازہ کر لو! بڑا نام ہوگا تمہارا۔"

"کیا اس لئے، صرف اس لئے کہ تو بیگانہ قوم کی عورت ہے؟ یہ تو نہ ہوگا۔ میں

اتحادیوں کی فوج کا سپاہی ضرور ہوں۔ مگر قوم اور وطن کے امتیازات سے آزاد ہوں جرمنوں سے لڑتا ہوں، اس لئے کہ سپاہی ہوں اور میرا فرض منصبی یہی ہے۔ لیکن قوم اور مذہب کا تعصب میرے نزدیک انسانیت کی نفی ہے، بہت ادنیٰ درجہ کی وحشیانہ بت پرستی ہے۔ "انسانیت" کے جھنڈے کے نیچے قوم اور مذہب کے امتیازات اسی سزا کے قابل ہیں جو جاسوس کو دی جاتی ہے۔ سمجھیں تم؟ تمہارا راز میرے دل میں محفوظ رہے گا! — مگر خدا کے لئے نقارے نہ بجا۔"

"تو کیا تم انسانیت کو وطنیت پر فائق سمجھتے ہو۔ یہ ایمان ہے تمہارا؟ یہی ایمان ہے میرا! کیسی ہے یہ تفریق! کیسا نفرت انگیز ہے یہ امتیاز۔ لعنت ہے قوم پرستوں اور وطن پرستوں پر ——— لعنت ہے!! انسانیت کے دشمن!" لعنت ہے بلیک سارنٹ ہے ——— آدمیت کے منکر۔ صلیب انگریز اور خدا! وطن اور قوم اور نسل! ——— کچھ نہیں! کچھ بھی نہیں! دھوکہ ہے سب فریب ہے سب۔ اصل ایک تھی ——— مگر جغرافیہ اور تاریخ اور سیاست نے ٹکڑے کر ڈالے ——— یہ کالا یہ گورا یہ بھورا یہ مشرقی یہ مغربی! تف ہے، تف ہے۔!!"

"تف ہے! تف ہے۔"

"مگر (مسکرا کر) بھٹکی ہوئی چھوکری! قوم و ملت کے تخیل پر تو بھی کہتی ہے تف اور میں بھی کہتا ہوں تف! مگر ——— مگر ——— کچھ مقاصد ہیں جن پر ہیں ——— اتحادی ——— ایمان رکھتے ہیں اور جن کے لئے ہم لڑ رہے ہیں۔"

" کیا مقاصد! یہ مقاصد کہ اس جنگ کے بعد دُنیا کے حالات بہتر بنا دیئے جائینگے زندگی کی منزلیں انسانوں کے لئے آسان کر دی جائیں گی۔ ——— یہ مقاصد! تم یہ کہتے ہو، تمہارے دشمن بھی یہی کہتے ہیں۔ اور شروع سے آج تک جتنے لڑنے والے لڑے ——— قوم کا نام لیکر چاہیئے وطن کا نام لے کر، یا مذہب کا نام لے کر ——— سب نے یہی کہا ——— مگر ہوا کیا، دنیا بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اور جس کا بازو قوی تھا، حق اُسی کے ساتھ رہا!! غنیمت ہے کہ ہم کو تم کو ایک دفعہ مر کے پھر واپس آنا نہیں ——— بہت غنیمت ہے۔ ورنہ آج سے زیادہ دُنیا کو بدحال پاتے۔"

(افسر کے چہرہ پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ مضطرب ٹہل رہا ہے)

" میں اب جاؤں گا ——— ٹھہر نہیں سکتا ——— مجھے روکو نہیں پھر ملوں گا کسی دن فرصت میں۔"

یہ معلوم کر کے کہ میں جرمن ہوں تم کو مجھ سے نفرت ہو گئی کیا؟ میں نہ کہتی تھی:"

" نہیں نہیں! میں نے کہدیا کہ میرا دل وطن و قوم کے متعلق اُن اہمانے جذبات اور تعصبات سے پاک ہے! بالکل پاک ہے ——— مگر مجھے شب میں کچھ قیدیوں کو لے کر جانا ہے۔"

" قیدی؟ جرمن قیدی؟"

" ہاں! جرمن قیدی، کیا تمہارا کوئی عزیز بھی قید ہے۔؟"

(لڑکی کے چہرہ پر انتہائی دلچسپی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔)

" کیا خبر؟ لیکن بتاؤ قیدیوں کی حالت کیا ہے۔ ہیں تو سب اچھی طرح۔"

یکایک مکان کی دیوار کے نیچے ایک اخبار فروخت کرنے والا لڑکا آواز لگاتا ہے۔

"شام کا تازہ پرچہ —— اتحادیوں کی عظیم الشان فتح —— جرمنوں کی شکست —— دو ہزار قیدی —— جرمن محاذ ٹوٹ گیا ——"

دونوں دروازے کی طرف دوڑتے ہیں۔ ایک ایک پرچہ دونوں خریدتے ہیں۔ اور دونوں الگ الگ کرسیوں پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

نوجوان افسر کا چہرہ چمک رہا ہے۔ وہ بار بار ہر خبر کو پڑھتا ہے۔ اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے، پھر اخبار پڑھتا ہے —— پھر ٹہلنے لگتا ہے۔ ایک دفعہ بے اختیار مسکراتا ہے،

"کیا خوب! کیا کارنمایاں کیا ہے ہمارے جنرل نے۔ واہ، کمال کر دیا۔ واللہ! بدمعاشوں کو کیا سزا دی ہے۔ یہ محاذ ٹوٹ گیا تو پھر برلن تک راستہ صاف ہے —— زندہ باد برطانیہ —— زندہ باد قوم برطانوی۔

لڑکی دریچہ کے پاس کھڑی اخبار پڑھ رہی ہے۔ اس کا چہرہ مغموم ہے۔

"دو ہزار قیدی! اور خدا جانے کتنے مجروح اور مقتول!! اے اللہ رحم کر میری قوم پر! میرے وطن پر! خیر! خیر ابھی کیا ہے۔ دیکھا جائے گا! دیکھا جائے گا ابھی میرا وطن ایسا بے دم نہیں ہوا ہے —— دیکھنا —— دیکھنا شیر برطانیہ کی کھال نہ کھینچ لی —— زندہ باد! جرمنی!!"

دونوں اپنے اپنے زاویہ نظر سے باطل کے مقابلہ میں حق کا بول بالا کر رہے تھے اور چند ہی منٹ پہلے یہ دونوں قوم و نسل کے امتیازات اور تعصبات سے کس قدر آزاد تھے !!

حب وطن کا فریب!!
انسانیت کی موت!!

مَیں اکیلا ہوں

اندھیری رات، طوفانی سمندر، ٹوٹی ہوئی کشتی، ساحل بہت دور، انسانوں کی بستیاں بعید۔ اور موجوں کے بے پناہ طمانچے۔ موجوں کو خبر ہے کہ مَیں اکیلا ہوں! میری زندگی اور میری موت کے درمیان حد فاصل معدوم! موت کو بھی خبر ہے کہ میں اکیلا ہوں،

اس سفر میں کوئی شجر سایہ دار، مسافر نواز نہیں —— میں اکیلا ہوں —— اور میرے سر پر آسمان ہے۔ سمندر کی وسعت لا انتہا۔ گہرائی بے پایاں۔ آسمان کا پھیلاؤ بے حد —— موت کا ہاتھ لانبا۔ خبر نہیں کل صبح میری آنکھیں سورج کی روشنی دیکھ سکیں گی یا نہیں، یا اُن کا نور بھی فنا ہو جائے گا۔ موت کے انتظار نے —— جس میں خوف ہے اور کچھ شوق —— اُن عزیزوں کی یاد کو بھی دل سے مٹا دیا ہے، جو ساحل کے کنارِ عافیت میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ میرے لئے آنسو بہا رہے ہوں گے۔ اس آخری شب میں میرا مونس و رفیق اُن ستاروں کی جھلک کے سوا کوئی نہیں جو آسمان کی چادر پر بکھرے ہوئے میری کشتی کو موجوں پر اُچھلتے دیکھ رہے ہیں۔ اُن کا نور یک گونہ مسافر نواز ہے۔!

نامہ و پیام کی تمام راہیں بند ہیں۔ مگر شب تار کی ٹمٹماتی ہوئی یہ آنکھیں کوئی پیام مجھے دے رہی ہیں۔ رحمت اور شفقت کی خشکی اس پیام میں ہے اور امید فردا۔"

آسمان کی اس ننھی فوج کا سردار، چاند۔ گویا سمندر سے نہا کر نکل رہا ہے۔ اس کی کرنیں موجوں پر لوٹ رہی ہیں۔ اس طرح جس طرح میری کشتی۔ مگر اس کی آنکھوں کا نور ستاروں کی طرح متحرک نہیں۔ میرے لئے اس کے پاس کوئی پیام، کوئی اشارہ نہیں۔ شاید اُسے معلوم بھی نہیں کہ میری کشتی اس کے نور میں غرق ہے۔

آفتاب! وہی جس کو کل شام تک میں دیکھتا رہا۔ اسی سمندر کے پانی میں غرق ہو گیا تھا — کہیں اندر چھپا بیٹھا ہوگا۔ وہ تو کل ہی مجھ سے کہہ گیا تھا کہ اب تیری صورت نہ دیکھوں گا — صبح جب وہ نہا دھو کر سمندر سے نکلے گا تو میں اپنا آخری غسل کر چکا ہوں گا۔

ماہتاب اجنبی ہے! سورج خفا ہے! سمندر کلیجے سے لگا لینا چاہتا ہے۔ رفیق وہ بھی نہیں۔ اُس کے پیٹ میں آگ لگی ہے۔!

شب کی چند ساعتیں باقی ہیں۔ وہی ٹوٹی ہوئی کشتی میں ایک ٹوٹا ہوا دیا جل رہا ہے۔ ہوا اس کو گُل نہ کر سکی۔ موجیں اس کو بجھا نہ سکیں۔ اس کا فانوس اس کو بچائے ہوئے ہے۔ وہ نورانی تیلیوں کے ایک قفس میں رکھا ہوا ہے۔ بہت سی آندھیاں اس پر گذر چکیں۔ جب میری کشتی اس قدر کمزور نہ تھی تو میں کبھی سورج کی پروا کرتا تھا نہ چاند کی۔ میرا چراغ سات سمندروں میں میرے لئے کافی ہوتا تھا۔ ابھی وہ روشن ہے — اس آخری شب میں! صبح جب پرانی تیلیوں کا فانوس ٹوٹ جائے گا تو ہوا کا ایک آخری جھونکا اس کے نور کو اپنے پروں میں لپیٹ کر نہ جانے کہاں لے جائے! کیا معلوم! شاید میں بھی — وہ "میں"

جو میرے اندر ہے وہ بھی ـــــ اسی نور پر اُن کے ساتھ سمندر کی موجوں کے آغوش سے نکل کر ہمیشہ کے لئے وہاں چلا جائے جہاں نہ سورج ہے نہ چاند۔ نہ تارے نہ طوفان، نہ موجیں، اُس سکونِ مطلق ہیں۔